مقالاتِ شرِ مصباحی

حصہ اول

مسمی بہ

نقد و نظر

(جزءاول)

مرتب

ڈاکٹر احمد جمال مبارک پوری

ایم ڈی (یو)

مقالاتِ شرر مصباحی (حصہ اول)

مسمی بہ

نقد و نظر

(جزء اول)

مرتب

ڈاکٹر احمد جمال مبارک پوری

ایم ڈی (یو)

نام کتاب	:	نقد ونظر جزءاول (مقالات شرر مصباحی)
مصنف	:	ڈاکٹر فضل الرحمن شرر مصباحی
مرتب	:	ڈاکٹر احمد جمال
سنہ اشاعت	:	۱۴۴۳ھ/2021ء
صفحات	:	۱۷۶
تعداد	:	۵۰۰ (پانچ سو)
قیمت	:	۱۷۵/روپے
مطبع	:	نیو انڈیا آفسیٹ پرنٹرس ۱۲۳۱، چوڑی والان، جامع مسجد دہلی۔۶
ناشر	:	انجینئر منظر سعید

Book Name	:	Naqd-o-Nazar Vol.1
Written by	:	Dr. Fazlur Rahman Sharar Misbahi
Compiled by	:	Dr.Ahmad Jamal
Pages	:	176
Published in	:	October 2021
Published by	:	Manzar Sayeed
Price	:	Rs.175
Printed at	:	New India Offset Priters 1231, Choori Walan, Jama Masjid, Delhi-6

ملنے کے پتے:

- ڈاکٹر احمد جمال، قمر ہاسپیٹل سمودھی روڈ، مبارک پور، ضلع اعظم گڑھ
  موبائل نمبر: 9795168255
- منظر سعید، ای۔ ۲۴۴/ پی، اسٹریٹ نمبر ۲۳، شاہین باغ اوکھلا، نئی دہلی۔ ۲۵
  موبائل نمبر:9891955786

انتساب

عزیز ذوالقدر، ادیب شہیر، سخن فہم و سخن شناس
ڈاکٹر قمرالہدیٰ انصاری مبارک پوری
کے نام
جو
ہم سے بچھڑ کر جوارِ رحمت میں راحت آسودہ ہیں
سَقَی اللّٰہُ ثَرَاہ وَجَعَلَ الْجَنَّۃَ مَثْوَاہ

ساری متاعِ زیست اُٹھا لے گیا کوئی
آنکھوں سے میرے خواب چرا لے گیا کوئی
جس سے جہانِ فکرِ سخن تاب ناک تھا
وہ روشنیٔ طبع رسا لے گیا کوئی
اب کس میں اپنے عیب و ہنر دیکھئے شررؔ
اک آئنہ تھا وہ بھی اُٹھا لے گیا کوئی

احتساب

بر درِ خواجه بیا گر تو خدا می خواہی | از درِ غیر چہ خواہی و چرا می خواہی
زخم بر تن تہی برگ حنا می جوئی | کشتۂ جاں نشوی رنگ حنا می خواہی
آہِ سوزاں نہ کشی آہِ رسا می طلبی | پنبہ در گوش کنی صوت و صدا می خواہی
بندۂ پیر مغاں ایں چہ روا می بینم | بطِ مے در بغل و ہوش بجا می خواہی
نہ غمِ ہجر مقدر نہ ہمِ دہر نصیب | دردِ دل ہیچ نداری و دوا می خواہی
واعظا! لذت درماں نچشیدی شاید | دردِ دل داری و دار وے شفا می خواہی

شعر می گوئی، بسے ہم چو تو گویند شرر
چہ عجب کردی کہ داد از شعرا می خواہی

آج تیس برس بعد بسمل صاحب نے فکر و فن و شوق سے اظہار خیال کر کے نعت کے مجموعہ کی شکل میں مجموعے منظر عام پر آ رہے ہیں۔ نظموں نے غزل اور نظموں میں ان کی اپنی شناخت ہے۔ ایک عالی نعت و منقبت ہے

نعتیہ شاعری میں احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ مجھے ملا علی عرفی شیرازی نے بہت کہا ہے

عرفی مشتاب ایں رہ نعت است نہ صحرا است
آہستہ کہ رہ بر دم تیغ است قدم را

بعض شعراء غلبۂ عشق اور جوشِ عقیدت میں احتیاط کا دامن چھوڑ دیتے ہیں یہاں تک کہ شاعر اور منصب رسالت کا بیان شایانِ شان نہیں کرتے جبکہ بارگاہ رسالت میں افراط اور تفریط دونوں سے احتراز لازم ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم یقیناً خدا نہیں ہیں لیکن اپنے زمانہ میں جو علوم نشر کیا دیگر انبیاء و رسل سے بھی افضل و برتر ہیں اپنے رسول کو خود منصب نبوت کشف عطا کرتے ہیں۔ اہل علم سے پوشیدہ نہیں ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ بسمل صاحب کا کلام اس افراط و تفریط سے پاک ہے

زیرِ نظر مجموعہ نعت کا بیشتر حصہ ابتدائی دور کا ہے۔ اپنے بچپن کے زبان و بیان میں وہ بے ساختگی نہیں ہے جو بعد کے کلام میں پائی جاتی ہے پھر بھی ان اشعار کو مجموعے میں شامل کرنا اسلئے مناسب ہے تاکہ مستقبل کے تجزیہ نگار اور بسمل صاحب کے فکر و فن کے تدریجی ارتقاء کا جائزہ لینے میں آسانی ہو۔ البتہ مجموعہ کے اشعار میں خلوص و عقیدت کا اظہار ہے۔ شرک و تشبیہ سے مبرا ہے

اللہ تعالیٰ اس مجموعہ نعت کو حضرت ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل میں قبول فرما کر بسمل صاحب کیلئے سرمایۂ آخرت بنائے۔ آمین بجاہ حبیبہ سید المرسلین

محمد فضل الرحمٰن [illegible]

۲ دسمبر ۹۳ء

پرنسپل [illegible] دہلی ۔ ۵

مشمولات

عرض مرتب

زیر نظر کتاب سے پہلے والد محترم کی چھ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ "نقد و نظر" کے بعد مؤقر ماہنامہ جام نور دہلی کے معروف کالم "تذکار" میں جن بزرگ شخصیات کا تذکرہ ہے، عنقریب اس کو کتاب کی شکل میں پیش کیا جائے گا اور دیگر رسائل اور خاص نمبروں میں اسلامی شخصیات کے تعلق سے جو مضامین شائع ہوئے ہیں، ان کو بھی اس کا حصہ بنایا جائے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ مستقبل قریب میں وہ خطوط بھی شائع کیے جائیں گے جو والد محترم نے اہل علم کے نام لکھے ہیں اور وہ مکتوبات بھی جو والد محترم کو اہل علم نے تحریر فرمائے ہیں۔ والد محترم کے رفیق درس ڈاکٹر احتشام الحق قریشی کے وقیع مضمون "من واو کیستیم" سے ہمیں تکمیل الطب کالج کے دور طالب علمی کی اہم معلومات حاصل ہوئیں اس کے لئے ہم ڈاکٹر قریشی صاحب کے تہِ دل سے شکر گزار ہیں۔

معروف عالم دین مولانا ڈاکٹر غلام عبد القادر حبیبی صاحب کا مضمون بھی شامل کتاب ہے، ڈاکٹر حبیبی اپنے پی ایچ ڈی کی تیاری کے زمانے سے والد محترم کے رابطے میں رہے ہیں، ماہنامہ ماہ نور کے ایک اہم مقابلہ جاتی پروگرام میں جس کی کمیٹی میں ڈاکٹر عبد النعیم عزیزی، مولانا یسین اختر مصباحی اور والد محترم تھے، آپ فرسٹ پوزیشن کے مستحق قرار دئے گئے، کہیں کہیں موصوف کی تحریر میں حقیقت بیانی کے ساتھ حسن عقیدت کی جھلک بھی آ گئی ہے، ہم شکریہ کے ساتھ ان کی تاثراتی تحریر کو کتاب کا حصہ بنا رہے ہیں۔

آخر میں عرض ہے کہ اس کتاب کے چند مضامین کی پروف ریڈنگ، مولانا قمر الزماں مبارک پوری نے کی اور چند مضامین کی مولانا ابرار رضا مصباحی نے اور باقی مضامین کی ڈاکٹر حبیبی نے۔ پھر بھی غلطی کے امکان سے انکار نہیں ہے۔ لہٰذا اہل نظر کو جہاں ٹائپنگ میں غلطی نظر آئے بے تکلف نشان دہی فرمائیں۔ قبول حق کا ثواب حاصل کیا جائے گا اور آئندہ اشاعت میں اس کی تصحیح کر لی جائے گی۔

احمد جمال

حرفِ چند

زیر نظر کتاب کے کئی مقالات دہلی کے معروف ماہنامہ جام نور میں شائع ہو چکے ہیں۔ ان مقالات میں جہاں بعض معاصر اہل قلم کے تعلق سے کہیں کہیں الفاظ میں شدت آ گئی ہے، یہ محض بتقاضائے وقت ہے۔ ورنہ یہ سب اہل علم و ہنر میرے لئے ذاتی طور پر قابل احترام ہیں۔

محترم عبدالستار ہمدانی گجراتی جماعت اہل سنت کے معروف اسکالر ہیں۔ اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی سے عقیدت رکھتے ہیں۔ موصوف کی کتاب ''فن شاعری اور حسان الہند'' میرے مطالعے میں آئی تو مجھے کہیں کہیں عقیدت کی فراوانی اور حقیقت سے دوری نظر آئی۔ میں نے دوران مطالعہ بعض مقامات کو نشان زد کر دیا حسن اتفاق کہ کچھ دنوں کے بعد رضوی کتاب گھر دہلی میں ہمدانی صاحب سے ملاقات ہوگئی میں نے ان سے اپنی تشویش کا اظہار کیا تو انھوں نے بڑی فراخ دلی سے کہا کہ آپ سرخ پین لے کر ان اسقام کی نشان دہی کر دیجیے۔ میں آئندہ اشاعت میں درست کرلوں گا۔

لیکن چند ماہ کے بعد مجھے پاکستان کا معروف ماہنامہ معارف رضا موصول ہوا اس میں ہمدانی صاحب کی اس کتاب پر تبصرہ کرتے وقت فاضل تبصرہ نگار نے اسے اتنی اہمیت دے دی کہ ہند و پاک کے جامعات اور مدارس کی نصابی کتب میں شامل کرنے تک کی سفارش کر ڈالی جس سے میرے فکر و خیال میں تبدیلی پیدا ہوئی اور طالبان علم کو گمراہی سے بچانے کے لئے مجھے ایک طویل مضمون قلم بند کر کے اسے شائع کرنے پر مجبور ہونا پڑا اور ہمدانی صاحب کے اس ارشاد "کہ آئندہ اشاعت میں......الخ" کا انتظار غیر ضروری سمجھا۔ چناں چہ آج برسوں بعد نہ تو اس کتاب کی دوسری اشاعت عمل میں آئی نہ ہی میری تحریر کے جواب میں موصوف کی طرف سے کوئی مثبت یا منفی تحریر سامنے آئی۔

زیر نظر کتاب میں ایک عنوان ''استفسارات اور جوابات'' کا ہے۔ ہوا یہ کہ آسی فاؤنڈیشن کے ڈائرکٹر نے مجھے دیوان آسی اور دیوان فانی کی تصحیح کے لئے ہر ایک کے چند نسخے

دیئے۔ یہ کام بہت اہم تھا۔ میں نے کوشش کی کہ پیر طریقت مولانا عبید الرحمن رشیدی صاحب کے ایما پر جو کام مجھے سپرد کیا گیا ہے، اس کی تکمیل میں، میں اُن کے اعتماد پر پورا اُتروں۔ اس دوران ڈائرکٹر فاؤنڈیشن جو کہ تصوف کے طبعی مزاج کے ساتھ شعر فہمی کا بھی ستھرا ذوق رکھتے ہیں، مجھ سے مختلف موضوعات پر تحریری سوال کرتے رہے اور میں حسب توفیق جواب دیتا رہا۔ افادۂ عام کے لئے وہ استفسارات اور اُن کے جوابات شامل کتاب ہیں۔

میں ڈاکٹر خوشتر نورانی حفظہ اللہ (مدیر اعلیٰ ماہنامہ جام نور دہلی) کا ممنون و متشکر ہوں کہ انھوں نے میری گزارش پر ''بروقت دستیاب مضامین'' امریکہ سے ای میل کے ذریعہ بھیج کر میرے کام کو آسان بنادیا۔

شرر مصباحی

من و او کیستیم

پروفیسر احتشام الحق قریشی　ایم ڈی☆

اس وقت میرے پیش نظر برادرم ایف آر شرر مصباحی کے مجموعۂ مقالات کے ''نقد و نظر'' کا مسودہ ہے۔ مجھ سے کہا گیا ہے کہ تکمیل الطب کالج میں ہمارا تقریباً ۱۲ برس کا ساتھ رہا ہے اس لئے آپ سے زیادہ مجھے کون سمجھ سکتا ہے اس حسن طلب کے ساتھ مجھے اظہارِ خیال کی دعوت دی گئی ہے۔

میں نے نقد و نظر کے مقالات دیکھے کچھ تو میں آسانی سے سمجھ سکا اس کے لئے مصباحی صاحب کو تہ دل سے مبارک باد اور جو مجھے کنز دقائق نظر آئے ان کی تحسین و آفریں کے لئے بہ جبر و اکراہ ذہن کو مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ بہ الفاظ دیگر جو کچھ میرا فہمیدہ ہے وہ پسندِ خاطر ہے اور جو نافہمیدہ ہے اس کے لیے مخلصم مصباحی صاحب کے جملے مستعار لیتا ہوں وہ یہ کہ غالب کے جو اشعار سہل الفہم ہوتے ہیں اکثر اہل علم ان کو قدرِ اول کی چیز سمجھتے ہیں اور جن کا عقدہ لاینحل ہوتا ہے ان کو اور بھی گراں قدر گمان کیا جاتا ہے، یہی صورت حال یہاں بھی ہے، یہ اس اعتماد کا نتیجہ ہے جو علم و فضل کے اعتبار سے برادرم مصباحی صاحب پر مجھے روز اول سے قائم ہے۔

نہ میں شاعر ہوں، نہ ادیب، نہ شاعری کے اصول و فروع سے میری طبعی مناسبت ہے، بس اتنا ہے کہ برسوں پہلے لکھنؤ یونی ورسٹی کے دبیر کامل کورس کا امتحان دے کر سند حاصل کی تھی، مصباحی صاحب فاضل علوم مشرقیہ ہیں، لکھنؤ یونی ورسٹی سے فاضل ادب ہیں، لکھنؤ کے دوران قیام یہاں کے فصحائے زبان سے استفادہ کرتے رہے ہیں، معروف شاعروں کے حلقہ نشیں رہے ہیں اس لئے ان کے فکر و فن پر اظہار خیال سے جان چھڑانے کے لئے میرے پاس معقول عذر تھا۔

فاضل دوست نے ''محاسبے'' اور ''غمزۂ چشم ہمزہ'' جیسی تحقیقی کتابیں لکھ کر اہل علم سے

☆ سابق پرنسپل اسٹیٹ تکمیل الطب کالج لکھنؤ، سابق پرنسپل اسٹیٹ یونانی میڈیکل کالج، الہ آباد

خراج تحسین حاصل کیا ہے۔ بیروت کے دوران قیام وہاں کے چند اطبا نے طب کی معروف کتاب ''شرح الاسباب والعلامات'' کی تصحیح و تنقیح موصوف کی نگرانی (Under Supervision) میں انجام دی جس کی طباعت کی خواہش کا اظہار CCRUM کے ڈائرکٹر جنرل ڈاکٹر محمد خالد صدیقی نے اپنے آفیشیل لیٹر کے ذریعے کیا تھا۔اس خط کا عکس ''غمزۂ چشم ہمزہ'' کے ص ۱۲۶ پر ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

راقم بھی اس ذکر خیر کے تحت بطور تحدیثِ نعمت عرض گزار ہے کہ طب یونانی کے موضوعات پر چند کتابیں تصنیف کر کے احقر نے بھی قدر دانانِ علم کو محروم نہیں کیا ہے۔

ایف ایم بی ایس کے ہمارے فرسٹ ائیر کے ساتھیوں میں ایک بڑا نام جناب الطاف احمد اعظمی کا ہے جنھوں نے سیکنڈ ائیر میں Migrate ہو کر حکیم اجمل خاں طبیہ کالج مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ میں داخلہ لے لیا تھا۔

شبلی و سہیل کا خطہ بھی عجیب ہے، فیضان تجلّی کا حامل بھی ہے اور یہاں کا ذرہ ذرہ نیر اعظم تمثال بھی۔کسی فارسی شاعر نے غالباً شیراز کے لیے کہا تھا۔

این زمینے ست کہ ایں جا ہمہ لیلیٰ خیزد

اگر اس کا گزر اس تعلقہ کی طرف ہوتا تو شاید یوں گویا ہوتا

این زمینے ست کہ ایں جا ہمہ دانا خیزد

جیسا کہ عرض کیا گیا ''نقد و نظر'' پر اظہار خیال سے جان چھڑانے کے لئے میرے پاس معقول عذر تھا لیکن یہ خیال کر کے کہ برادرم مصباحی صاحب نے مجھ پر جس اعتماد کا اظہار کیا ہے اسے ٹھیس نہ لگ جائے اس لئے سرسری طور پر ''نقد و نظر'' پر اپنا عندیہ پیش کرنے کے بعد صاحب نقد و نظر کے تعلق سے کچھ یادداشتیں قلم بند کر رہا ہوں جو شاید میرے بعد طاقِ نسیاں کی نذر ہو جائیں گی۔

میرے ایک اور ہم سبق حکیم سید کمال حیدر رضوی جو اسی خطۂ علم و ادب اعظم گڑھ سے تعلق رکھتے ہیں، شعر و سخن کا اچھا ستھرا ذوق رکھتے ہیں، شیدا تخلص کرتے ہیں، موصوف کا تفرد یہ ہے کہ مادر علمی تکمیل الطب کالج کا مشہور ترانہ آپ ہی کے قلم کا رہین منت ہے، میرے محلے کے

قرب میں رہتے ہیں، میں نے ان سے بھی اس مضمون کی ترتیب کے دوران استصواب کیا ہے۔

1963-64ء کے تعلیمی سیشن تکمیل الطب کالج لکھنؤ میں ایف ایم بی ایس کورس میں داخلہ لینے کے لئے میں شاہ جہاں پور سے لکھنؤ گیا، کالج میں ایک اور امیدوار جو اپنا داخلہ فارم پُر کر چکے تھے، ان سے میں نے گزارش کی کہ میرا فارم بھی بھر دیجیے، یہ تھے جناب فضل الرحمن مصباحی جو مبارک پور ضلع اعظم گڑھ سے آئے ہوئے تھے، قصہ مختصر، ہمارا انٹرویو ہوا، داخلہ ہوا اور ہاسٹل میں ہمارے لئے روم الاٹ کیے گئے، تعلیمی سیشن کا آغاز ہوا، کلاسیں لگنے لگیں۔

ان دنوں ہمارے ہاسٹل میں دو سینئر طالب علم جناب رئیس احمد خاں اور جناب محمد زکریا خان کا بڑا دبدبہ تھا، ہاسٹل میں Discipline کا بہت خیال رکھا جاتا تھا۔ سینئر، جونیئر پر شفقت فرماتے تھے جونیئر اپنے سینئر کا احترام کرتے تھے ہاسٹل کے باہر تہبند اور چپل کے ساتھ نکلنا ممنوع تھا، یہ رخصت صرف گلی کی مسجد میں نماز پڑھنے جانے کے لئے تھی، رئیس خان صاحب اعظم گڑھ کے بڑے زمین دار کے بیٹے تھے، مصباحی صاحب پر کچھ تو علاقائی عصبیت کی وجہ سے اور کچھ ان کی علمی لیاقت کے سبب بہت مہربان تھے، فرسٹ ایئر کے طلبہ میں جب کلاس نمائندہ (Class Representative) منتخب کرنے کا وقت آیا تو رئیس احمد خاں صاحب کے ایما پر مصباحی صاحب نمائندہ منتخب ہوئے۔

پھر سیکنڈ ائیر میں ہاسٹل کے اسسٹنٹ وارڈن کی جگہ پُر کرنے کے لئے گورکھپور کے کلیم اللہ خاں کو نامزد کیے جانے کی خبر اُڑی جو ہمارے لئے ناپسندیدہ تھے تو میں حکیم مسیح الزماں ندوی پرنسپل کالج کے مطب واقع گھسیاری منڈی گیا۔ میں نے کہا کہ سنا ہے کہ آپ کلیم اللہ خاں کو اسسٹنٹ وارڈن بنانا چاہتے ہیں، تاکہ ان کو ہاسٹل فیس معافی کا فائدہ حاصل ہو جائے۔ پرنسپل صاحب کی خاموشی سے ظاہر ہوا کہ یہ بات صحیح ہے۔ میں نے مصباحی صاحب کے نام کی پر زور سفارش کی، پرنسپل صاحب نے بادلِ ناخواستہ میری بات مان لی، یوں دوسرے یا تیسرے دن مصباحی صاحب کے نام اسسٹنٹ وارڈن شپ کا آفیشیل لیٹر صادر ہو گیا۔

ہمارے کالج میں ہر سال طبی ویک (Tibbi Week) منایا جاتا تھا، بیت بازی، اسپورٹس، فیشن شو اور شناخت ادویہ وغیرہ پروگرام ہوتے تھے جس میں طلبہ حصہ لیتے تھے، ہر

پروگرام کا نگراں کالج کا کوئی ٹیچر ہوتا تھا۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے، اسپورٹس کے نگراں ڈاکٹر محمد اکمل شمسی تھے، چوک ایریا کے کمپنی باغ میں ریس (Race) کا مقابلہ تھا۔ ۱۰۰ میٹر اور ۲۰۰ میٹر ریس اور ہائی جمپ کا مقابلہ ہوا، مصباحی صاحب نے ۱۰۰ میٹر ریس اور ۲۰۰ میٹر ریس میں پہلا مقام حاصل کیا اور ہائی جمپ میں اپنے ضلع کے ہی موضع جین پور کے سمیع اللہ خاں صاحب کا چار سالہ ریکارڈ توڑ کر اول پوزیشن حاصل کی اور ہائی جمپ میں مصباحی صاحب کا یہ ریکارڈ فائنل ایئر تک قائم رہا، میں ان پروگراموں میں تماشائی کی حیثیت سے شامل ہوتا تھا کبھی اس شغل نامطبوع کا حصہ دار نہیں بنا۔ البتہ شناخت ادویہ کے مقابلے میں فرسٹ ایئر سے فائنل تک میری فرسٹ پوزیشن قائم رہی۔

بیت بازی بھی پروگرام کا حصہ تھی، فرسٹ ایئر میں حکیم شکیل احمد شمسی (پرنسپل) کی نگرانی میں پروگرام شروع ہوا، حکیم شمسی صاحب خود بہت اچھے شاعر تھے، عزیز لکھنوی، محشر لکھنوی اور آرزو لکھنوی جیسے اہل زبان کے مصاحبین میں تھے، انھوں نے بیت بازی کا آغاز علامہ اقبال کے شعر سے کیا، جس کا ایک مصرع مجھے یاد ہے ع

پھر ان شاہیں بچوں کو بال و پَر دے

اب حرف ''یا'' سے شعر کہنا تھا، یوں دو گروپ میں شعروں کا تبادلہ ہوتا رہا، مصباحی صاحب نے اپنے مقابل گروپ کے شعر کے جواب میں ایک شعر پڑھا جس کا آخری حرف ''ضاد'' تھا، اس حرف سے کسی شعر کی اُٹھان بہت کم دیکھی گئی ہے، ہمارے ایک ساتھی ضیاء الدین قدوائی جو بڑے بذلہ سنج اور حاضر جواب تھے جب ان کے گروپ کے افراد بغلیں جھانکنے لگے اور قریب تھا کہ حکیم شمسی صاحب نتیجہ کا اعلان کر دیتے، ضیاء الدین نے برجستہ ایک شعر موزوں کر کے سب کو حیرت میں ڈال دیا، افسوس کہ وہ شعر اس وقت ذہن میں نہیں ہے اتنا یاد ہے کہ مصرع اول کی ابتدا ''ضبط عشق'' سے تھی اور دوسرا ''آنسو نکلے راہ بدل کے'' تھا۔ حکیم شمسی صاحب بھی مسکرانے لگے۔

حکیم محمد مسیح الزماں ندوی یوں تو میلاد فاتحہ کے قائل نہیں تھے لیکن ہر سال اپنے استاد محترم شفاء الملک حکیم عبدالحمید مرحوم کی یاد میں ''حمید ڈے'' مناتے تھے ایک پروگرام میں

مصباحی صاحب نے حمید ڈے کی مناسبت سے ایک نظم لکھی جس کا پہلا مصرع کچھ یوں تھا:

یاد شفاء الملک غضب کا تیر جگر پر مارے ہے

یہ نظم ہمارے سینئر امتیاز احمد اعظمی نے اپنے مخصوص ترنم میں پڑھی تھی، یہ وہی امتیاز احمد ہیں، جو بعد میں ساغر اعظمی کے نام سے مشہور ہوئے۔

ایک دن ہمیں خبر ہوئی کہ ضلع سلطان پور کے ایک ستم رسیدہ نواب صاحب سعادت گنج میں اپنے کتب خانے کے ساتھ تشریف لائے ہیں، کتابیں اونے پونے داموں بیچ رہے ہیں، میں نے مصباحی صاحب سے کہا کہ چلیے کچھ کام کی کتابیں ملیں گی تو خرید لیں گے، ہم پتا ڈھونڈ کر نواب صاحب کی قیام گاہ پر پہنچے، ہزاروں کتابیں بے ترتیب پڑی ہوئی تھیں، ہم نے اپنے ذوق اور ضرورت کے مطابق کتابیں خریدیں، اسی وقت لکھنوی وضع قطع میں ایک بزرگ نظر آئے جو ایک عمدہ اور بیش قیمت کاغذ اور جلد کی کتاب ہاتھ میں لئے اس کی ورق گردانی کرنے لگے ، یہ نواب عثمان علی خاں بہادر والی دکن کے خاندان کی تصاویر کا البم تھا، اس البم کی تصویروں کو حسرت بھری نگاہ سے دیکھتے ہوئے موصوف نے جو شعر پڑھا تھا، وہ مجھے اب تک یاد ہے۔

اللہ رے زورِ قلم صانع قدرت
تصویر سے تصویر کی صورت نہیں ملتی

یہ تھے لکھنؤ کے معروف زبان داں جناب مرزا مہذب لکھنوی جنھوں نے اردو زبان اور محاورے پر مشتمل ایک ضخیم لغات ''مہذب اللغات'' لکھ کر اردو پر احسان عظیم کیا ہے۔

رام پور کے مشہور شاعر جناب رئیس رام پوری لکھنؤ آتے تو مجھ سے ملاقات کرنے کے لئے ہاسٹل ضرور تشریف لاتے، میرے تعلقات ذاتی تھے لیکن شعر و سخن کے حوالے سے مصباحی صاحب اور سید کمال حیدر رضوی سے انھیں ایک خاص ربط تھا، ہمارے دو جونیئر محمد طیب اور صلاح الدین پر وہ بہت مہربان تھے، رئیس رام پوری بڑے خوش طبع، خوش مزاج اور خوش گو شاعر تھے، تغزل ان کے مزاج میں سرایت کیے ہوئے تھا، روم نمبر ۲ میں شعر و شاعری کا دور چلتا رہتا، ایک موقع پر علامہ نشور واحدی بھی روم نمبر ۲ رمیں رات بھر کے لیے ٹھہرے اور رات گئے

تک شعر و سخن کا شغل جاری رہا، اب یہ یادیں کانٹا بن کر چبھ رہی ہیں۔

ایف ایم بی ایس کورس کی تکمیل کے بعد میں نے حکیم اجمل خاں طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں ایم ڈی کورس میں داخلہ لے لیا اور مصباحی صاحب نے اپنے وطن مبارک پور لوٹ کر مطب کا آغاز کیا، جب کورس مکمل کرنے کے بعد میرا تقرر مادر علمی تکمیل الطب کالج لکھنؤ میں ہوا تو میں نے کچھ دنوں کے بعد مصباحی صاحب کو مطلع کیا کہ موقع اچھا ہے، تدریس کی جگہ خالی ہے، آپ بھی آجایئے، انھوں نے کچھ عذر کیا، میں نے کہا کہ یہاں صبح وشام مطب کرنے کی بھی رخصت ہے اس لئے آپ فائدے میں رہیں گے، مختصر یہ کہ انھوں نے 1971ء کے اواخر میں درخواست دی، انٹرویو کے لئے بلائے گئے اور منتخب ہو گئے۔ سلیکشن کمیٹی کے چیئرمین شری مکندی لال دویدی ڈائرکٹر آیورویدا اینڈ یونانی سسٹم آف میڈیسن اتر پردیش تھے اور ممبران میں حکیم شکیل احمد شمسی آنریری سکریٹری تکمیل الطب کالج اور حکیم مسیح الزماں ندوی پرنسپل کالج تھے، آنریری سکریٹری صاحب نے ٹیلی گرام کے ذریعے ڈیوٹی جوائن کرنے کے لئے بلایا۔

تقرر ہو گیا، ڈیوٹی جوائن کر لی، اب قیام کا مسئلہ درپیش تھا، میں نے آنریری سکریٹری سے گزارش کی کہ مصباحی صاحب کے لئے عارضی طور پر قیام کا بندوبست کر دیجیے، سکریٹری صاحب نے کالج اسپتال کے اسٹاف کوارٹر میں ایک روم الاٹ کرا دیا اور جواز کی شکل یہ پیدا کی کہ مصباحی صاحب اپنے فاضل اوقات میں ریذیڈنٹ میڈیکل آفیسر (RMO) کی حیثیت سے اضافی ڈیوٹی انجام دیں گے۔

مصباحی صاحب کا مضمون کلیات اور معالجات تھا، کلیات کے صدر شعبہ حکیم فیاض علی صدیقی تھے اور معالجات کے حکیم محمد مسیح الزماں ندوی تھے، کچھ دنوں کے بعد حکیم شمسی صاحب کالج کی سکریٹری شپ سے مستعفی ہو گئے اور بانی کالج کے خانوادے کے جناب سید امتیاز علی صاحب اس عہدہ پر فائز ہوئے اور حکیم ضیاء الدین ضیا الہ آبادی کالج کے پرنسپل مقرر ہوئے۔ مصباحی صاحب کی علمی اور ادبی صلاحیتوں کو دیکھتے ہوئے موصوف کو کالج میگزین کا چیف ایڈیٹر بنایا دیا گیا۔

آنریری سکریٹری صاحب نے کالج کے نظم و نسق کو سنبھالنے کے لئے مجھے چیف پراکٹر

بنا دیا تو میں نے ان سے گزارش کی کہ اس اہم فریضے کو بحسن وخوبی انجام دینے کے لئے حکیم مصباحی صاحب کو میرا معاون بنا دیجیے، میرا مشورہ قبول کیا گیا اور مصباحی صاحب کو اسسٹنٹ پراکٹر بنا دیا گیا، یوں ہی گیمس سپرنٹنڈنٹ کی خالی جگہ کو بھی حکیم مصباحی صاحب سے پُر کیا گیا۔

RMO کی اضافی ڈیوٹی کے عوض اسٹاف کوارٹر میں جو مصباحی صاحب کو روم الاٹ کیا گیا تھا، اب انھیں شفا خانہ کی برانچ واقع گھسیاری منڈی میں انچارج فزیشین بنا کر پرائیوٹ وارڈ میں روم الاٹ کیا گیا اور حکم نامہ میں یہ تحریر تھا کہ اس اضافی ڈیوٹی کے عوض جو رقم اس فارمیسی میں فروخت ادویہ سے موصول ہوگی اس کا تیس ۳۰ رفی صد معالج کو دیا جائے گا۔

وہ لمحہ میرے لیے لمحۂ یادگار ہے جب کہ میرے عقد مسنون کے موقع پر مصباحی صاحب نے سہرا لکھا اور تقریباً بیس برس کے بعد جب میرے صاحبزادے کے عقد کی تاریخ مقرر ہوئی تو میں نے مصباحی صاحب سے کہا کہ باپ کا سہرا آپ نے لکھا جو ایک مصرع تھا، اب بیٹے کے سہرے سے مصرع کو شعر بنا دیجیے۔ مصباحی صاحب نے ایک مرصع سہرا لکھا جسے عزیز ذوالقدر حکیم اشہر قدیر نے ''سہروں کا گلدستہ'' میں شامل کر کے شائع کیا۔ موصوف اُن دنوں جامعہ ہمدرد دہلی میں تھے، اب بحمد اللہ حکیم اجمل خاں طبیہ کالج مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ میں صدر شعبۂ کلیات ہیں۔

جو کچھ عرض کیا گیا ہے یہ محض یادداشت کی بنیاد پر ہے بیان واقعہ میں تقدم وتأخر کا فرق ہوسکتا ہے۔ کالج ریکارڈ سے اس کی تصویب کی جاسکتی ہے۔

احتشام الحق قریشی
فہمیدہ کاٹیج، توپ دروازہ، لکھنؤ
۱۲ر اگست ۲۰۲۰ء

...بچہ نامت خوانم

ڈاکٹرغلام عبدالقادرحبیبی پی ایچ ڈی☆

ڈاکٹر ایف آر (فضل الرحمن) شررمصباحی نے دیار پورب کے مردم خیز خطہ محلہ کٹرہ مبارک پورا عظم گڑھ میں ۱۵ جون ۱۹۴۴ء کو آنکھیں کھولیں، بچپن سے ہی آپ کی پیشانی سے ''می تافت ستارۂ بلندی'' کے آثار نمایاں تھے، آپ نے مکتب کے بعد درس نظامیہ کی تعلیم کا آغاز شوال ۱۳۷۳ھ/ ۱۹۵۵ء سے کیا اور ابتدا سے دار العلوم اشرفیہ میں ہی رہ کر فضیلت تک کی تعلیم مکمل کی اور ۱۹۶۲ء میں سند و دستار فضیلت سے نوازے گئے۔

آپ اشرفیہ کے وہ قابل فخر اور سعادت مند فرزند ہیں کہ استاد گرامی جلالۃ العلم حافظ ملت محدث مبارکپوری قدس سرہ نے آپ کو ''الولد العزیز'' کہا اور لکھا، ۱۹۷۱ء میں آپ نے سربراہ اعلیٰ کے وضع کردہ دستور اساسی میں دستورسازی کے وقت دو دفعات کا اضافہ کر کے اسے منظور کرایا، (جام نورتذکار کالم) اور ادارہ کی دونوں کمیٹیوں (مجلس انتظامیہ اور مجلس شوریٰ) کے رکن نامزد کئے گئے۔

آپ نے تین سال مادر علمی میں معین المدرسین کی حیثیت سے تدریسی خدمات انجام دیں اور دوران طالب علمی ہی ازہار العرب کی شرح ''مصباح الادب'' (بزبان عربی) لکھ کر اکابر علم وادب کی نگاہوں میں آگئے، اساتذۂ علم وفن واساطین عصر کی طرف سے داد وتحسین سے نوازے گئے، خاص کر جلالۃ العلم حافظ ملت محدث مبارکپوری قدس سرہ سربراہ اعلیٰ جامعہ اشرفیہ مبارکپور، علامہ حسن الاعظمی سابق پروفیسر و پراکٹر جامعہ ازہر مصر، قاضی اطہر مبارکپوری وغیرہ نے آپ کی صلاحیت پر زبان عربی میں، علامہ اثر لکھنوی اور علامہ نیاز فتحپوری وغیرہ نے اردو میں آپ کے لئے حوصلہ افزا کلمات تحریر کئے۔ (غمزۂ چشم ہمزہ ص ۴، ۵، ۱۱۴ تا ۱۲۶)

☆صدر آل انڈیا تبلیغ سیرت دہلی

شمالی ہند کے تعلیمی مرکز اور اہل سنت کے ''باغ فردوس'' جامعہ اشرفیہ مبارک پور سے فراغت کے بعد تکمیل الطب کالج لکھنؤ سے ۱۹۶۹ میں FMBS کا پنج سالہ کورس مکمل کیا۔

۱۹۷۲ء سے تدریسی سفر شروع ہوا اور ۲۰۰۴ء میں آپ ریٹائرڈ ہوئے۔

دوران ملازمت دو درجن سے زائد تعلیمی او رانتظامی سرکاری و نیم سرکاری، عہدوں کو حسن خدمات سے چار چاند لگائے، سرکاری اور غیر سرکاری ایوارڈ و اسناد سے بھی سرفراز کئے گئے۔ جن میں دہلی گورنمنٹ کا اسٹیٹ ایوارڈ فار سروس ڈاکٹرس(SATE AWARD for Service Doctors Govt. of NCT of Delhi) خاص طور پر قابل ذکر ہے جو دہلی کی چیف منسٹر شریمتی شیلا دکشت نے مولانا آزاد میڈیکل کالج آڈیٹوریم (Auditorium) میں ۱۴ جنوری ۲۰۰۱ کو عطا کیا تھا۔

رٹائرمنٹ کے بعد ڈاکٹر رام منوہر لوہیا اسپتال اور دین دیال اپادھیائے اسپتال نئی دہلی میں علی الترتیب یونانی میڈیکل سنٹر اور یونانی اسپیشلیٹی سنٹر میں سینئر کنسلٹنٹ کی خدمات پر مامور ہوئے اور اپنی غیر مطبوعہ کتابوں اور مطبوعہ مضامین و مقالات کی جمع و ترتیب اور اس کی اشاعت کی طرف متوجہ ہوئے، زیر نظر کتاب ''**نقد و نظر**'' اسی سلسلہ کی ساتویں کڑی ہے۔

اچھی نثر نگاری جتنی دشوار ہے صاحب طرز ہونا اتنا ہی دشوار تر، اسلوب کی انفرادیت، زبان کی نفاست، لطیف و نادر تشبیہات، منظر نگاری کا حسن و جمال، خیالات کی پاکیزگی، تحریر کی پختگی، سلاست و روانی، فکر و نظر کے اعلیٰ تحقیقی زاویے Standard Quality اور اعلیٰ معیار مطبوعہ تصانیف اور متنوع مقالات و مضامین کے سبب ڈاکٹر صاحب کا شمار معاصر ادیبوں، دانشوران علم و ادب میں ہونے لگا، علم عروض وقوافی میں مہارت اس پر مستزاد۔

تحصیل علم کا زمانہ بھی اگر جوڑ دیا جائے تو عمر عزیز کی تقریباً سات دہائیاں ڈاکٹر صاحب نے تعلیم و تعلم، تحقیق و مطالعہ اور علم و ادب کی خدمت میں گزاریں، آپ نے اس طرح مدرسہ اور دینی ماحول سے عصری دانش گاہوں کالج اور یونی ورسٹی تک شخص سے شخصیت کا طویل اور کامیاب سفر طے کیا۔

پختہ فکر، دلکش اسلوب تحریر، شستہ زبان، سنجیدہ انداز بیان اور بے لاگ اظہارِ حقیقت کی وجہ سے آپ کے نام کی دھمک ہے، اردو داں طبقے اور مسلم حلقے کے دور دراز ممالک میں آپ کی تحریریں سنجیدگی سے پڑھی جاتی ہیں اور آپ ارباب نقد و نظر میں ''عظیم ماہر لسانیات'' سے متعارف ہیں، ایک تعارفی تحریر، عالمی یوم یونانی میڈیسن کے یادگار مجلہ سے پیش ہے:

''تاریخ حکمائے طب کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے بیشتر اطبا شعر و سخن کا ستھرا ذوق رکھتے تھے، شیخ الرئیس ابو علی ابن سینا سے مسیح الملک حکیم اجمل خاں تک اس سلسلۃ الذہب کو ملاحظہ کیا جا سکتا ہے، دور حاضر میں علامہ نیاز فتحپوری اور حضرت اثر لکھنوی کے فیض یافتہ، تکمیل الطب لکھنؤ کے سند یافتہ اور اے اینڈ یو طبیہ کالج کے سابق صدر شعبہ معالجات جناب حکیم ایف آر مصباحی مبارکپوری کو ایک عظیم ماہر لسانیات اور صاحب فن شاعر کی حیثیت سے بھی جانا جاتا ہے۔''

(اداریہ، یادگار مجلہ، عالمی یوم یونانی میڈیسن، ۲۰۱۶، ص ۴۱)

اور عصر حاضر کے ایک عظیم دانشور اور صاحب تصانیف کثیرہ حکیم وسیم اعظمی نے ڈاکٹر صاحب کو یوں خراج عقیدت پیش کیا ہے:

''حکیم فضل الرحمن مصباحی دبستان لکھنؤ کے پروردہ ہیں، اردو دبستان کے بھی اور طبی دبستان کے بھی، جس کا اظہار ان کی ادبی اور طبی نگارشات میں ہوتا ہے، کلیات اور معالجات میں انھیں اختصاص کا مرتبہ حاصل ہے، .... میں انھیں طبی ادب کا رشید حسن خاں اور کلیم الدین احمد کہتا ہوں۔'' (تکمیل الطب کالج لکھنؤ کی علمی خدمات ص ۱۸۹)

نثر نگاری، الفاظ کی موزوں نشست و برخاست، صوتی ہم آہنگی، سلاست و روانی، حسن لفظی، جمال معنوی، صوری دلکشی، باطنی بالیدگی و شیفتگی کا آئینہ ہے، ایک ماہر لسانیت کا قول ہے کہ ''عظیم ترین معانی عظیم ترین الفاظ کے متقاضی ہوتے ہیں، کلام امام اور ہماری سخن فہمی کے آغاز میں آپ کی تحریر اس کا منہ بولتا ثبوت اور لاجواب شاہکار ہے جس میں کلام امام کا

تعارف کراتے ہوئے بطور مبصر شوکت الفاظ کا استعمال یوں کرتے ہیں:

''شعر و سخن میں حضرت امام کا مقام بہت بلند ہے، ان کی شاعری میں زبان کی حلاوت ہے، تعبیر کی ندرت ہے، انداز بیان کی شگفتگی ہے، غیر معمولی رسائی ذہن ہے، روزمرہ کا برمحل استعمال ہے، آہنگ اور لب و لہجہ کا حسین امتزاج ہے، صنائع و بدائع اس پر مستزاد۔

تاہم ان کی شاعری کا امتیاز یہ ہے کہ انہوں نے ''ہر چہ از دل خیزد بر دل ریزد'' کی شاعری کی ہے، پاکیزہ جذبات کے اظہار کے لیے متناسب الفاظ کے انتخاب کا انہیں ہنر تھا، استخواں بندیِ الفاظ کی انہیں پوری مہارت تھی۔''

ڈاکٹر صاحب کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں ناچیز راقم کا آپ کے ساتھ زمانۂ ریسرچ سے تعلق خاطر ہے، آپ کی شخصیت کے محاسن اور صلاحیت سے متعلق کسی طرح کی خیال آرائی یا رائے زنی سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔

زیر نظر کتاب کے مطالعہ سے قارئین کو بھی اندازہ ہوجائے گا کہ آپ نے جس عنوان کو بھی موضوع سخن بنایا اس سے متعلق تمام جزئیات کا پوری دقت نظر اور دیانت کے ساتھ احاطہ کیا ہے۔

بااین ہمہ اوصاف!

میرے نزدیک ڈاکٹر ایف آر مصباحی کی زندگی کا سب سے بڑا، تاریخی اور علمی کارنامہ عربی زبان میں طب کی مشہور زمانہ کتاب ''الاسباب والعلامات'' کی تصحیح و تدوین ہے، علامہ نفیس بن عوض کرمانی (812-890ھ) کی یہ کتاب ''شرح الاسباب والعلامات'' غیر منقسم ہندوستان سے آج تک مشاہیر اطبا کے نزدیک اور طبی اداروں میں مقبول عام رہی ہے، جلیل القدر اطبا نے اس پر حواشی لکھے ہیں، ان میں حکیم محمد شریف خان (1722-1807ء) کا ''حاشیہ'' نمایاں اور اہم ہے، اطبائے متاخرین نے اس کے اردو زبان میں تراجم کیے جن میں حکیم خواجہ رضوان احمد (1906-1972) اور حکیم محمد کبیر الدین (1894-1979) کے

تر جموں کو زیادہ شہرت حاصل ہوئی، تاہم طبی شہرت واہمیت اور عربی زبان میں کتاب ہونے کے باوجود تادم تحریر بلاد عرب میں اس کی طباعت واشاعت نہیں ہو پائی تھی، یہ امر باعث حیرت بھی ہے اور قابل افسوس بھی، اس وقت A - 4 سائز میں کتاب کی پہلی اور دوسری جلد(Hard Copy) میرے پیش نظر ہے، جوایک ہزار (۱۰۰۰) صفحات پر محیط ہے، اس کے مقدمہ میں حیرت وافسوس کا اظہار ان الفاظ میں مرقوم ہے:

''وللاسف لم يطبع هذاالكتاب فى البلاد العربية حتى الآن مع اهميته و شهرته''(مقدمہ:ص٦)

ڈاکٹر مصباحی کے تحتِ اشراف (Under Supervisin) اس کتاب کی تحقیق و تعلیق کا بیڑا بیروت کے دو محقق اطبادکتور سید سمیر فاعور اور دکتور سید شفیق الدیک نے اٹھایا، دہلی اور حلب کی یونیورسٹیز اور بوسٹن یونیورسٹی(Boston University)امریکہ سے اس کتاب کے قدیم نسخے حاصل کیے، ان نسخوں میں کمی بیشی اور کچھ الفاظ ایسے نظر آئے جواہل عرب کے لئے اجنبی، نامانوس اور غیر مفہوم تھے، اس لئے کہ علامہ کرمانی نے فارسی الفاظ و مصطلحات کا بھی اس کتاب میں استعمال کیا ہے۔

اس لئے ایک ایسے نسخے کی ضرورت محسوس کی گئی جو نقص سے پاک ہو، مقاصد (Objectives)اور جدید تحقیق کے علمی طریقۂ کار(Scientific Methodology) کو سامنے رکھ کر مدون کی گئی ہو، اس کے لئے دو صاف ستھرے مخطوطہ کا انتخاب کیا گیا جن میں ایک جامعہ ہمدرد دہلی کا دوسرا بوسٹن یونیورسٹی (Boston University) امریکہ کا نسخۂ مخطوطہ شامل تھا، یہ کام ۲۰۰۵ء میں شروع ہوا، مقدمہ کے الفاظ ہیں:

ولقد اعتمدنا اول الامر على نسختين من جامعة همدرد فى نيو دهلى ...كما تيسر لنا بعون الله نسخة من جامعة برنستن الامريكية ويسر الله لنا ان جمعنا بالطبيب فضل الرحمن المصباحى الهندى ...فقرأنا عليه هذا الكتب و بعض الكتب الاخرى ---فقمنا بعون الله على تحقيق ذلك راجين من الله

تعالی التوفیق۔ ''(مقدمہ:ص٦)

ڈاکٹر مصباحی نے ایک اہم کام یہ کیا کہ کرمانی کے استعمال کردہ فارسی الفاظ و مصطلحات کی عربی زبان میں حاشیہ کے اندر وضاحت کر دی۔ دوسرا اہم کام یہ بھی ہوا کہ جو عربی کے الفاظ غیر عرب علما میں غلط تلفظ کے ساتھ زبانوں پر رائج ہیں، ان کی تصحیح کے لئے جامعہ بیروت کے ایک فاضل ادیب کی خدمات حاصل کی گئیں تا کہ تلفظ کی بھی تصحیح ہو جائے، اس طرح ٢٠٠٨ء کے آخری تین ماہ میں لبنان کی راجدھانی بیروت میں یہ گراں قدر کام پایۂ تکمیل کو پہونچا۔

یہ وہی کتاب ہے جس کی تحقیق وتدوین کا علم ڈائرکٹر CCRUM ڈاکٹر محمد خالد صدیقی کو ہوا تو انھوں نے ڈاکٹر مصباحی سے اس کی طباعت کی خواہش کا اظہار ١٠/اکتوبر ٢٠٠٥ء کو اپنے آفیشیل لیٹر میں کیا تھا، جس کا عکس غمزۂ چشم ہمزہ کے ص ١٢٦ پر موجود ہے۔ بہر حال ڈاکٹر مصباحی کی زندگی کا یہ علمی کارنامہ تاریخ طب میں سنہری حرفوں سے لکھا جائے گا اور یاد کیا جائے گا۔

غلام عبدالقادر حبیبی

22 پرجاپتی محلہ میدان گڑھی نئی دہلی نمبر ٢٠٠٦٨

٧ صفر المظفر ١٤٤٣ مطابق ١٥ ستمبر ٢٠٢١ بروز بدھ

کلام امام اور ہماری سخن فہمی

امام احمد رضا خاں بریلوی کی ہشت پہلو شخصیت پر ہندو پاک کے علاوہ دیگر ممالک میں بھی حسب مقدور ریسرچ اور تحقیق کا کام ہو رہا ہے، شعر و سخن کے حوالے سے ادھر بیس پچیس برسوں میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور یہ سلسلہ تواتر کے ساتھ جاری ہے لیکن حضرت امام کے فن شاعری کے تعلق سے محترم عبد الستار ہمدانی کی کتاب "فن شاعری اور حسان الہند" میں نسبتاً زیادہ تطویل کے ساتھ شعری اور فنی جائزہ لیا گیا ہے اور کئی اہم، انوکھے اور چونکا دینے والے گوشے سامنے آئے ہیں۔

ہمارے اکثر قلم کار حضرت امام کے فکر و فن کا جائزہ لینے میں بالعموم عقیدت سے کام لیتے ہیں اور بہ استثنائے چند "لنکا میں جسے دیکھا باون گز کا" کی مثل کی یاد دلاتے ہیں۔ عروض و قوافی، معانی و بیان اور صنائع و بدائع کا بقدر ضرورت علم نہ رکھتے ہوئے بھی اس وادی پر خار میں اپنی جولانی فکر کے گھوڑے دوڑاتے رہتے ہیں نتیجہ کار محتاط، غیر جانب دار اور ستھرا مذاق سخن رکھنے والے ارباب نظر ان تحریروں کا مضحکہ اڑاتے ہیں۔

شعر و سخن میں حضرت امام کا مقام بہت بلند ہے، ان کی شاعری میں زبان کی حلاوت ہے، تعبیر کی ندرت ہے، انداز بیان کی شگفتگی ہے، غیر معمولی رسائی ذہن ہے، روزمرہ کا برمحل استعمال ہے، آہنگ اور لب و لہجہ کا حسین امتزاج ہے، صنائع و بدائع اس پر مستزاد۔ تاہم ان کی شاعری کا امتیاز یہ ہے کہ انھوں نے "ہر چہ از دل خیزد بر دل ریزد" کی شاعری کی ہے، پاکیزہ جذبات کے اظہار کے لیے متناسب الفاظ کے انتخاب کا انہیں ہنر تھا، استخواں بندیِ الفاظ کی انہیں پوری مہارت تھی۔

زیر نظر کتاب میں ہمدانی صاحب نے شاعری کے اصول و قواعد سے بھی بحث کی ہے اور صنائع پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ اس پر اظہار خیال سے پہلے محترم نظمی صاحب کی "تقریظ دل پذیر" پر اپنے تاثرات پیش کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

مارہرہ مطہرہ کے نظمی صاحب سے میں پہلے سے واقف نہیں تھا، "فن شاعری اور حسان الہند"

کی تقریظ ہی علمی تعارف کا ذریعہ بنی اور یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ خانقاہ برکاتیہ مارہرہ مطہرہ کے صاحب سجادہ ہیں۔ یہ خانقاہ اعلیٰ حضرت عظیم البرکت اور حضور مفتی اعظم ہند علیہما الرحمۃ کا مرکز عقیدت ہے، مزید علیہ آں موصوف محترم عبدالستار ہمدانی کے پیرو مرشد کے پیرزادے ہیں، اس اعتبار سے بھی وہ میرے لیے لائق احترام ہیں، اب میرے لیے انتہائی آزمائش کی گھڑی ہے کہ عقیدت پر حقیقت کو قربان کر دوں یا کیا کروں؟ اس مشکل وقت میں حضور فاضل بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کا تصور کر کے آنکھیں بند کیں تو پردۂ خیال پر یہ نقش ابھرا "**شعاع الشمس لا یخفی و نور الحق لا یطفی**" لہٰذا چند سطور اس اعتراف کے ساتھ سپرد قلم ہیں کہ اگر اہل نظر کو میری تحریر سے اختلاف ہو تو بے تکلف میری فروگزاشت پر تنبیہ فرمائیں، اس بندۂ آثم کو قبول حق کا ثواب حاصل ہوگا۔

محترم نظمی صاحب نے زیر نظر کتاب کو حرف حرف پڑھا ہے، املا و انشا کی غلطیوں کو درست بھی کیا ہے اور اس امر کا امکان بھی ظاہر کیا ہے کہ اب بھی کچھ غلطیاں رہ گئی ہوں گی۔ ظاہر ہے یہ فروگزاشتیں کچھ اس طرح کی ہوں گی، "وہ کمال حسن حضور ہے کہ گمان نقص جہاں نہیں" (ص:۱۰۰) کو بحر وافر سالم میں لکھ دیا گیا ہے جب کہ یہ نعت بحر کامل سالم میں ہے، وغیرہ۔ لیکن تقریظ کی عبارات سے ظاہر ہے کہ معانی و مفاہیم کے اعتبار سے یا جو کچھ شعری قواعد اور صنائع کے تعلق سے کہا گیا ہے وہ نظمی میاں کے نزدیک درست ہے۔ یہاں مجھے آں موصوف سے اتفاق نہیں ہے جس کی قدرے تفصیل اپنے مقام پر آئے گی۔

نظمی میاں نے اپنی تقریظ میں لکھا ہے کہ:

> "اس کتاب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں ہمدانی صاحب نے کلام رضا اور اردو کے نام نہاد صف اول کے شعراء کے کلام کے درمیان جو تقابلی موازنہ کیا ہے وہ اپنی نوعیت کا منفرد کارنامہ ہے۔" (ص:۲۹)

قطع نظر اس سے کہ موازنہ میں خود تقابلی شان پائی جاتی ہے، محترم تقریظ نگار نے ان تمام شعرا کو جن کے کلام سے حضرت امام کے کلام کا موازنہ کیا گیا ہے اور حضرت امام کے کلام کو فنی اعتبار سے ارفع و اعلیٰ ثابت کرنے کا دعویٰ کیا گیا ہے ان اساتذۂ سخن کو "نام نہاد صف اول کے

شعراء'' کہا گیا ہے، اس فہرست میں میر تقی میر، حکیم مومن خاں، مرزا اسد اللہ خاں غالب اور فانی بدایونی جیسے خداوندان سخن بھی شامل ہیں علاوہ ازیں نظمی صاحب نے اس پہلو سے بھی غور کرنے کی زحمت نہیں اٹھائی کہ امام احمد رضا کے کلام کو نام نہاد صف اول کے شعرا کے کلام سے موازنہ کر کے ہمدانی صاحب نے کون سا نیک کام کیا ہے یہ تو سراسر وقت کا ضیاع ہوا۔ اس کے علی الرغم محترم سید محمد اشرف مارہروی نے اپنی تقریظ میں حقیقت کا اعتراف ان لفظوں میں کیا ہے:

> ''اور اس پیش کش کا خصوص یہ ہے کہ اس میں تقابلی انداز میں اردو ادب کے اساطین کے کلام کو کلام امام احمد رضا کے ساتھ تقابل کیا گیا ہے۔'' (ص:۳۸)

میں یہ سوچ کر حیران ہوں کہ یا اللہ! مارہرہ سے مارہرہ تک میں کس قدر بعد مسافت ہے۔ نظمی صاحب رقم طراز ہیں:

> ''برسوں ہو گئے مجھے بھی شاعری کرتے ہوئے مگر آج تک فن شاعری کے بارے میں مجھے بھی وہ کچھ معلوم نہ تھا جو ہمدانی صاحب نے اپنی اس کتاب میں بتایا ہے۔ (ص:۲۳)

یقیناً اہل عقیدت اس عبارت کو کسر نفسی پر محمول فرمائیں گے لیکن کتاب کے مندرجات کو دیکھتے ہوئے ایسا لگتا ہے کہ آں موصوف نے اسے دقت نظر سے ملاحظہ نہیں فرمایا ورنہ یہ بات ان کی زبان قلم سے ہرگز نہ نکلتی کہ:

> ''ہمدانی صاحب نے اپنی تصنیف میں فن شاعری کے مختلف پہلوؤں کو جس ماہرانہ، فنکارانہ اور مشاقانہ انداز میں پیش کیا ہے اس کی بدولت یہ کتاب ہمارے کالجوں اور یونیورسٹیوں کے اردو ادب کے نصاب میں شامل کیے جانے کے قابل ہو گئی ہے۔''

حیرت ہے کہ اسی مضمون کا ایک اشتہار ''معارف رضا'' کراچی کے شمارہ دسمبر ۲۰۰۴ء میں بھی احقر کی نظر سے گزرا ہے، مجھے امید ہے کہ محترم سید صبیح رحمانی جیسے صاحب نظر اس اشتہار پر

''نعت رنگ'' میں اپنا تأثر پیش فرمائیں گے۔

اس کتاب میں جناب سید محمد اشرف مارہروی کی تقریظ بھی شامل ہے۔انہوں نے نہایت حزم واحتیاط کے ساتھ قلم اٹھایا ہے، ایک طرف مارہرہ مطہرہ سے ہمدانی صاحب کی عقیدت ترحم کی متقاضی، دوسری طرف اشرف میاں کی منصف مزاجی حق گوئی کی طالب، ایسے میں سید صاحب نے اپنے اشہب قلم کو جس زیرکی کے ساتھ مہمیز کیا ہے یہ انھیں کا حصہ ہے۔ یقینا انہیں بہت سے مقامات پر کتاب کے مندرجات سے اختلاف رہا ہوگا لیکن ممکن حد تک انہوں نے **''صنعت ترحم''** سے کام لیا ہوگا، البتہ جہاں اپنا عندیہ ظاہر نہ کرنا علم وفن کے ساتھ کھلی ہوئی زیادتی متصور ہوتی نظر آئی وہاں انہوں نے بڑی متانت کے ساتھ اصلاحی انداز میں اپنے قلم کو حرکت دی ہے، مثلاً صف اول کے شعرا کی جو فہرست دی گئی ہے نہ تو حرف تہجی اس کی بنیاد ہے، نہ یہ فضیلت کے لحاظ سے ہے، نہ سال ولادت کے اعتبار سے، جب کہ ترتیب میں کسی نہ کسی شق کا لحاظ کرنا تھا۔

یہاں اشرف میاں نے بڑا خوبصورت انداز اصلاح اختیار کیا ہے، لکھتے ہیں:

''مولانا ہمدانی نے اس فہرست کو زمانی قید کا پابند نہیں رکھا ہے۔'' (ص:۴۹)

بظاہر یہ ایک سرسری عبارت ہے لیکن غور کیجیے تو یہ ایک ایسی غلطی کی نشاندہی ہے جو کسی ستھرے مذاق سخن رکھنے والے سے متصور نہیں ہو سکتی۔

یونہی ایک مقام پر لکھتے ہیں:

''جب تک وہ (اپنے اعتبار سے) موضوع سے انصاف نہیں کر لیتے انہیں چین نہیں آتا۔'' (ص:۳۳)

یہاں قوسین کی عبارت نے اشرف میاں کو احساس ذمہ داری کی اونچی کرسی پر بٹھا دیا ہے۔ اور درج ذیل عبارت نے تو اشرف میاں کے شعور علم وفن کے دریا کو کوزے میں بند کر دیا ہے:

''بعض مقامات پر علامہ ہمدانی اپنی محبت کے ہاتھوں مجبور ہو جاتے ہیں اور ایسے ہر مقام پر اعلیٰ حضرت علیہ الرحمہ سے ان کی محبت بولتی ہوئی بلکہ چمکتی ہوئی محسوس ہوتی ہے''۔ (ص:۲۶)

قربان جایئے اس البیلی تحریر پر، کچھ کہتے کہتے قلم کا رخ ایسا پھیرا کہ قاری تک اپنے دل کی

بات بھی پہنچادی اور فاضل مصنف پر دست شفقت بھی دھرا رہا۔ اس کے علاوہ اشرف میاں نے اپنی تقریظ میں ''اردو شاعری کے اجزائے ترکیبی'' کا ایک عنوان قائم کر کے انھیں امور کا تعارف کرایا ہے جو ہمدانی صاحب کے یہاں ''لوازمات'' کے عنوان کے تحت ہیں، یہاں بھی انہوں نے ایک فاش غلطی کی اصلاح فرمائی ہے کیوں کہ لوازمات کے تحت جو کچھ انہوں نے تحریر فرمایا ہے، ان میں سے بیشتر کا تعلق ''لوازمات'' سے نہیں ہے بلکہ اجزائے ترکیبی سے ہے، اجزائے ترکیبی عین ذات ہوتے ہیں جب کہ ''لوازمات'' خارج ذات ہوتے ہیں۔

محترم ہمدانی صاحب نے لفظ ''صنعات'' کا جگہ جگہ استعمال کیا ہے اس جمع کا چلن اردو ادب میں کب سے ہوا، مجھے معلوم نہیں، بہر حال یہ جس زبان کا لفظ ہے اس میں صنعت کی جمع صنعات نہیں ہے، غالباً حرکت برکت کی جمع پر قیاس کر کے یہ جمع بنالی گئی ہے، مصنف نے لگ بھگ تیس صنائع کا اپنی کتاب میں ذکر کیا ہے اور ہر صنعت کی تعریف فیروز اللغات کے حوالہ سے درج کی ہے لیکن فیروز اللغات کے صفحات کے حوالہ سے معلوم ہوتا ہے کہ صاحب لغت نے ان سب کا ذکر صنعت کے تحت نہیں کیا ہے مثلاً صنعت استعارہ کے لیے صفحہ ۱۴۱ کا حوالہ ہے، صنعت تشبیہ کے لیے صفحہ ۳۶۱ کا اور صنعت مبالغہ کے لیے صفحہ ۱۱۹۳ کا، اس سے صاف ظاہر ہے کہ صنعت کا لفظ فاضل مصنف کا الحاق کیا ہوا ہے، اس کا ذکر اس لیے ضروری ہے کہ ان میں سے ہر ایک کا شمار صنائع میں نہیں ہوتا۔

(۱) ہمدانی صاحب تقطیع کے ذیل میں لکھتے ہیں:

> (۱) مکتوبی غیر ملفوظی یعنی وہ حروف جو لکھے جائیں لیکن بولنے اور پڑھنے میں نہ آئیں مثلاً ہائے مختفی، واو معدولہ، عربی کا الف وغیرہ تقطیع میں ان کا شمار نہیں ہوتا۔''

یہاں ہمدانی صاحب سے چوک ہوگئی ہے، عربی کا الف لکھنے میں بھی آتا ہے اور تقطیع میں بھی محسوب ہوتا ہے، اسی سلسلہ بیان میں موصوف نے درج ذیل شعر کی تقطیع کی ہے۔

گنہ گاروں کو ہاتف سے نوید خوش مآلی ہے
مبارک ہو شفاعت کے لیے احمد سا والی ہے

مفاعی‌لن   مفاعی‌لن   مفاعی‌لن   مفاعی‌لن

حالانکہ اس میں جتنے عربی کے الفاظ والے الف ہیں سب تقطیع میں محسوب ہوئے ہیں، اگرچہ یہ تقطیع حسب قاعدہ عروض غلط ہے تاہم میرا مدعا ثابت ہے، صحیح تقطیع یوں ہے۔

مفاعی‌لن	مفاعی‌لن	مفاعی‌لن	مفاعی‌لن
گنہ گارو	ک ہاتف سے	نویدے خش	مآلی ہے
مبارک ہو	شفاعت کے	لیے احمد	س والی ہے

''سا''، جو عربی نہیں ہے اس کا الف تقطیع میں محسوب نہیں ہوا۔

(۲) ہمدانی صاحب لکھتے ہیں:

''نعت رسول لکھنے کے لیے پہلی شرط شاعر کا قلب عشق رسول کی لازوال دولت کے گوہر شاداب سے معمور ہونا ہے'' (ص:۱۰۶)

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جس کی نعت لکھی جا رہی ہے اس رحمت عالم و عالمیاں صلی اللہ علیہ وسلم کے عشق کی دولت سے شاعر کے قلب کو معمور ہونا چاہیے، لیکن یہ شرط تو بارگاہ رسالت سے سند قبولیت اور حصول ثواب کے لیے لگائی جا سکتی ہے، نعت تو ایک صنف سخن کا نام ہے اس صنف کا استعمال اگر کوئی غیر مسلم کرے تو کیا اسے فنی نقطۂ نظر سے نعت اور شاعر کو نعت گو نہیں کہا جائے گا؟ شاعر[1] کا نام لیے بغیر میں اہل نظر سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ یہ اشعار نعتیہ ہیں یا نہیں؟

بجھے گی اب تو مری تشنگی قرینے سے
گھٹائیں آئی ہیں ساغر بکف مدینے سے
اے عطر بیزیِ خیر الامم تعالیٰ اللہ
مہک اٹھے ہیں دو عالم ترے پسینے سے[1]

(۳) ہمدانی صاحب رقم طراز ہیں:

''حضرت رضا بریلوی نے اپنے قصیدہ نور کے حسن مطلع کے ۴۶

---

(۱) اضافہ - یہ اشعار میرے جد امجد علیہ الرحمہ کے شاگرد منشی سہدیو رام کیف مبارک پوری کے ہیں

اشعار کے لیے ۹۲ قافیوں کے لیے کل ستاسی الفاظ کا استعمال فرما کر دنیائے ادب پر اپنی سخن شاہی کا سکہ بٹھا دیا ہے''۔ (ص: ۹۴)

اسی سلسلہ بیان میں آگے لکھتے ہیں:

''علاوہ ازیں اردو ادب کی کئی صنعات مثلاً صنعت تشبیہ، تضاد، اقتباس، استعارہ، تلمیح، مقابلہ، تجنیس کامل وغیرہ بکثرت پائی جاتی ہیں۔'' (ص: ۹۵، ۹۶)

شعرائے اردو نے صنائع کا استعمال بہت کیا ہے، سعادت یار خاں رنگینؔ اور انشاء اللہ خاں انشاؔ کے دواوین اٹھا کر دیکھیے، حکیم مومن خاں کی فاضلانہ تاریخ گوئی پر نظر ڈالیے، طبیعت عش عش کر اٹھے گی لیکن آج تک کسی شاعر کی فضیلت کا پیمانہ یہ مقرر نہیں کیا گیا ہے کہ فلاں شاعر کے دیوان میں مطالع زیادہ ہیں، فلاں شاعر کے یہاں تلمیح، مقابلہ اور تضاد وغیرہ صنائع کا استعمال زیادہ ہوا ہے اور فلاں شاعر نے سب سے زیادہ بحور میں اشعار کہے ہیں۔ غالب سے کون واقف نہیں؟ ہر آنے والے کل میں اس کے فکر وفن کے سکہ کی قیمت بڑھتی جاتی ہے لیکن کیا اس کی عظمت شعری کے اعتراف میں اہل سخن نے صنائع کی کثرت استعمال کی حصہ داری کا بھی ذکر کیا ہے؟ غالب نے مومن کے جس شعر کی تعریف کی ہے وہ اس لیے نہیں کہ اس میں صنعت پائی جاتی ہے بلکہ اس لیے کہ شاعر نے پیش پا افتادہ خیال کو آہنگ اور لب ولہجہ کی بدولت ذرّہ سے آفتاب بنا دیا ہے۔

کثرت مطالع یا دیگر صنائع کے استعمال کے تعلق سے مختصراً عرض کیا جا چکا ہے، مزید یہ کہ اگر تعدد مطالع یا صنائع و بدائع کی کثرت استعمال کو کسی شاعر کے عظیم اور قادر الکلام ہونے کا پیمانہ قرار دیا جائے یا مطالع و صنائع کے استعمال کی کمی پر شاعر کی مہارت فن سوالیہ نشان کے دائرے میں آ جائے تو پھر ان نامور شعرا کی بات تو الگ رہی جنہیں نظمی صاحب نے نام نہاد صف اول کے شعراء کہا ہے، اس کی زد میں ایسی ایسی ہستیاں بھی آ جائیں گی جن کا نام لینا بھی خود کو خطرے میں ڈالنا ہے۔

''قصیدہ نور'' میں (یہاں اصطلاحی قصیدہ مراد نہیں) حسن مطلع کے چھیالیس اشعار ہیں جسے ہمدانی صاحب نے غیر مکسر ریکارڈ قرار دیا ہے۔ (ص: ۹۳) سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ التزام دیگر قصائد میں کیوں نہیں ہے؟ حضرت سیدنا عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی مدح میں ۱۲۱۶ اشعار پر مشتمل جو قصیدہ ہے اس کا آغاز مطلع سے نہیں ہے یا مطلع مرتب کو دستیاب نہیں ہوا حسنِ مطلع کا یہ شعر ۹۳ نمبر پر ہے۔

نظر مجھ پہ دین کرم میں ہے واجب
میں خادم تو آقا، میں بندہ تو صاحب

ویسے ''غیر مکسر ریکارڈ'' کے دعویٰ کے پیش نظر عرض ہے کہ مرحوم ذوق دہلوی نے ''تسبیح زمرد'' کے نام سے ایک قصیدہ لکھا ہے جس میں ردیف وار ایک سو ایک مطلع ہے اور کوئی سبزی کے مضمون سے خالی نہیں ہے۔ (آب حیات ص: ۴۴۷)

محولہ بالا عبارت سے پہلے حسن مطلع کے سلسلۂ بیان میں صفحہ ۹۲ پر ہے ''حدائق بخشش حصہ دوم میں ایک قصیدہ حضرت رضا بریلوی نے غزل کے انداز میں مرقوم فرمایا ہے اس قصیدہ کا نام ''قصیدۂ نور'' ہے''۔

ہندو پاک کے کئی مشاہیر اہل قلم نے بھی اسے قصیدہ قرار دیا ہے اور اپنے دعویٰ کے ثبوت میں حضرت رضا کا یہ شعر اقبالی بیان کے طور پر پیش کیا ہے۔

اے رضا یہ احمد نوری کا فیض نور ہے
ہوگئی میری غزل بڑھ کر قصیدہ نور کا

دراصل یہ ایک بڑی غلط فہمی ہے جس کا ازالہ ضروری ہے، یہاں قصیدہ سے فنی قصیدہ مراد نہیں ہے، عام طور پر غزل کے اشعار کی تعداد کم ہوتی ہے اور قصیدہ کے اشعار کی تعداد زیادہ ہوتی ہے۔ اسی خیال کو حضرت امام نے اپنے اس شعر میں ظاہر کیا ہے، اس کے معنی یہ نہیں کہ نظم صنف غزل سے خارج ہوکر صنف قصیدہ میں داخل ہوگئی یا قصیدہ غزل کے رنگ و آہنگ میں متشکل ہوگیا۔

حضرت امام احمد رضا نے غزل اور قصیدہ کے قوام کے تاروں کا واضح فرق خود بیان کیا ہے جو

میرے دعویٰ کے ثبوت کے لیے کافی ہے۔ مشہور قصیدۂ مبارکہ مسمیٰ بہ فضائل فاروق کے حصہ ٔمتفرقات
میں حضرت امام فرماتے ہیں۔

سبب ہی کچھ ایسے پڑے آکے ورنہ
لغت اتنے بھرنے بھی کیا تھے مناسب
جناب قوافی کی کچھ تو عنایت
ادھر کچھ تقاضائے علمی بھی غالب
علاوہ ازیں حال کا مقتضی بھی
سکھاتا ہے عاقل کو فرق مراتب
زبان زناں تو غزل مانگتی ہے
قصاید ہیں اعلاق علمی کے طالب
یہ طوطی کے نغمے، عنادل کے لہجے
نہیں نعرۂ ضیغمی کے مناسب
اور ایسے تو بھاری لغت بھی نہیں ہیں
کہ کامل کو ہوں سنگ راہ مطالب
جسے ہوں وہ خود اپنی دانش سے الجھے
ہمارا تو یہ روز مرہ ہے صاحب

سطور بالا میں صنائع کے سلسلہ بیان میں سعادت یار خاں رنگین کا نام آیا تھا، رنگین نے اپنے دیوان میں ایسی ایسی صنعتوں کا استعمال کیا ہے کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے، صنعت اتصال تربیعی صنعت معاد کے نام سے غالباً اسی کی ایجاد ہے، جس کا ذکر کرتے ہوئے ہمدانی صاحب نے لکھا ہے کہ:

"حضرت رضا بریلوی پر ان کے کریم آقا و مولیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ فیض تھا کہ آپ نے مشکل سے مشکل صنعت میں بھی اپنی قادر الکلامی ثبت فرمادی ہے۔"

قارئین کی ضیافت طبع کے لیے اس مشکل سے مشکل صنعت میں رنگین کی یہ رباعی پیش ہے۔

فرہاد کو شیریں جو بہت آتی یاد
یاد اس کی میں اپنے دل کو رکھتا وہ شاد
شاد اس کا ہمیشہ ذکر رکھتا اس کو
اس کو کر یاد شاد رہتا فرہاد

اگر چہ اس رباعی سے صنعت اتصال تربیعی کا داعیہ پورا ہو گیا لیکن حق یہ ہے کہ حضرت امام کی رباعی کے چاروں مصاریع میں جو معنویت کا تدریجی ارتقا ہے اس کا رنگین کی رباعی میں دور دور پتا نہیں ہے۔

صنائع کے سلسلۂ بیان میں حکیم مومن خان کا نام آیا ہے انہوں نے حضرت شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ کی وفات کی تاریخ درج ذیل شعر سے استخراج کی ہے، سنیے اور سر دھنیے۔

دست بیداد اجل سے بے سر و پا ہو گئے
فقر و دیں، فضل و ہنر، لطف و کرم، علم و عمل

فقر، دین، فضل، ہنر، لطف، کرم، علم، عمل سب کو بے سر و پا کر دیجیے یعنی ہر لفظ کے اول و آخر حرف کو ہٹا دیجیے باقی بچے ق، ی، ض، ن، ط، ر، ل، م۔ ان اعداد سے ۱۲۳۹ برآمد ہوتا ہے یہی تاریخ رحلت ہے۔

صنعت مقلوب مستوی و مقلوب کل:

ہمدانی صاحب نے ان دونوں صنائع کے تحت غالب، فانی، شکیل بدایونی، اصغر گونڈوی، جگر مرادآبادی، غلام ربانی تاباں، جوش ملیح آبادی، جاں نثار اختر، فیض احمد فیض کے ۱۵/ اشعار اور کل ۱۳/ اشعار حضرت امام کے پیش کیے ہیں۔

دونوں صنعتوں سے دو دو شعر بطور مثال پیش ہیں۔

پیدا ہوئی ہے کہتے ہیں ہر درد کی دوا
یوں ہو تو چارۂ غم الفت ہی کیوں نہ ہو

غالب

دل پہ کندہ ہو ترا نام کہ وہ دزد رجیم
الٹے ہی پاؤں پھرے دیکھ کے طغرا تیرا

حضرت رضا

بالترتیب دونوں شعروں کی وضاحت یوں کی گئی ہے

(۱) درد کو الٹا کر پڑھیں گے تو بھی وہ لفظ ''درد'' ہی پڑھا جائے گا۔

(۲) اس شعر میں لفظ دزد کا استعمال کیا گیا ہے۔ یہ لفظ سیدھا یا الٹا یکساں ہی پڑھا جائے گا۔

صنعت مقلوب کل

یہ اتفاق زمانہ ہے اس کا رونا کیا
ملا ملا کوئی دل کا مزاج داں نہ ملا

تاباں

فرش والے تری شوکت کا علو کیا جانیں
خسروا عرش پہ اڑتا ہے پھریرا تیرا

حضرت رضا

بالترتیب دونوں کی وضاحت یوں کی گئی ہے: (۱) اس شعر میں جو ''ملا'' ہے اس کو الٹا دینے سے لفظ ''الم'' یعنی رنج، غم بنتا ہے۔ (۲) اس شعر میں لفظ ''فرش'' کو الٹا دینے سے لفظ ''شرف'' (بزرگی) بنتا ہے۔ ''کیا'' کو الٹا دینے سے ''ایک'' بنتا ہے۔ ''عرش'' کو الٹا دینے سے لفظ ''شرع'' (مذہب) بنتا ہے۔

صنعت مقلوب مستوی کے تحت جو اشعار مثال میں پیش کیے گئے ہیں جن میں ''درد'' اور ''دزد'' کا الٹا سیدھا برابر ہے اس میں شاعر کا کیا کمال ہے یہ تو لفظ کی ساخت ہے اس سے زیادہ تفصیل غیر ضروری ہے۔

صنعت مقلوب کل میں پہلے شعر میں ''ملا'' کا قلب الم ہے اور دوسرے شعر میں ''فرش'' کا قلب، ''شرف'' اور ''کیا'' کا قلب ''ایک'' اور ''عرش'' کا قلب ''شرع'' ہے۔

یہاں ہمدانی صاحب نے ادبی دیانت سے کام نہیں لیا حضرت امام کے شعر میں انہیں تین الفاظ نظر آئے جن کا قلب کیا ہے اور غلام ربانی تاباں کے شعر میں صرف ''ملا'' ملا جس کا قلب ''الم'' ہے حالآنکہ ہمدانی صاحب کی نظر سے دیکھا جائے تو تاباں کے شعر میں کئی الفاظ ایسے ہیں جن کا قلب ہوسکتا تھا

جیسے ''یہ'' کا قلب ''ہے''، ''ہے'' کا قلب ''یہ''، ''اس'' کا ''سا''، ''رونا'' کا ''انور'' اور ''کیا'' کا ''ایک''۔

خیر یہ تو ان کے طرز فکر کا جواب تھا، حقیقت یہ ہے کہ مقلوب کل میں جتنے اشعار شامل کیے گئے ہیں ان میں سے ایک کا بھی تعلق صنعت مقلوب کل سے نہیں ہے، کھلی ہوئی بات ہے کہ جب شعر میں قلب کا عمل ہی نہیں ہوگا تو صنعت مقلوب کا وجود کیوں کر ہوگا۔ یوں تو ہزاروں الفاظ ایسے ہیں جن کو مقلوب کرنے سے کوئی نہ کوئی بامعنی لفظ بن جائے گا۔ یہ سب کچھ صنعت مقلوب کا مفہوم نہ سمجھنے کا نتیجہ ہے، صنعت مقلوب کی مثال ہم تحریر کرتے ہیں پڑھیے اور سمجھیے، حسن اتفاق کہ انشاء اللہ خاں انشا کے یہ پانچوں اشعار صنعت قلب میں ہیں۔

(۱)

ابھی جھڑ لگا دے بارش کوئی مست بھر کے نعرہ
جو زمین پہ پھینک مارے قدح شراب الٹا

(۲)

تو جو باتوں میں رکے گا تو یہ جانوں گا کہ سمجھا
مرے جان و دل کے مالک نے مرا کلام الٹا

(۳)

مجھے مار کیوں نہ ڈالے تری زلف الٹ کے کافر
کہ سکھا دیا ہے تو نے اسے لفظ رام الٹا

(۴)

سحر ایک ماش پھینکا جو مجھے دکھا کے اس نے
تو اشارہ میں نے تاڑا کہ ہے لفظ شام الٹا

(۵)

فقط اک لفافہ پر ہے کہ خط آشنا کو پہونچے
تو لکھا ہے اس نے انشا یہ ترا ہی نام الٹا

وضاحت: - پہلے شعر کے مصرع اول میں لفظ بارش آیا ہے دوسرے مصرع میں اسکا قلب شراب، دوسرے شعر کے دوسرے مصرعے میں لفظ مالک آیا ہے اس کا قلب کلام، تیسرے شعر کے مصرع اول میں لفظ مار آیا ہے دوسرے مصرع میں لفظ رام، چوتھے شعر کے مصرع اول میں لفظ ماش آیا ہے دوسرے مصرع میں لفظ شام، پانچویں شعر کے مصرع اول میں لفظ آشنا آیا ہے دوسرے مصرع میں لفظ انشا۔ مطلب صاف ہے کہ جب تک شعر میں قلب کا عمل نہیں ہوگا صنعت متشکل نہیں ہوگی۔

مقلوب مستوی کی مثال:

کسی نے ایک عالم سے کہا: ''مرادے دارم'' عالم نے جواب دیا ''برآید یارب'' دونوں جملوں کو اول سے آخر تک یا آخر سے اول تک پڑھیے جملہ وہی رہے گا۔

حضرت امیر خسرو کا یہ شعر مقلوب مستوی کی صنعت میں ہے ؎

شکر بترازوے وزارت برکش
شو ہمرہِ بلبل بلب ہر مہوش

دونوں مصرعوں کو الگ الگ شروع سے آخر تک یا آخر سے شروع تک پڑھیے مصرع جوں کا توں رہے گا۔ درج ذیل عربی شعر پورا کا پورا مقلوب مستوی کی صنعت میں ہے۔

مودتہ تدوم لکل ہول
وھل کل مودتہ تدوم

رجعت قہقری: -''حسان الہند اور فن شاعری'' کے چند صفحات پڑھتے ہی ذہن میں یہ سوال ابھرتا ہے کہ کلام امام سے موازنہ کے لئے غزل گوشعرا کا انتخاب کیوں کیا گیا جب کہ نعت گوشعرا میں کئی باکمال اساتذہ فن کا نام سامنے تھا۔ حضرت تاج الفحول بدایونی، حضور نوری میاں مارہروی، شیخ المشائخ اشرفی میاں (کچھوچھا شریف) علیہم

الرحمہ کے کلام سے موازنہ کیا جاتا تو فکر وفن کا جوہر بھی نکھر کر سامنے آتا، روحانیت کی دنیا میں سیر کرنے کا لطف بھی حاصل ہوتا اور مصنف کے انتقادی شعور اور فنی دیانت کا مظاہرہ بھی ہوتا۔ ماضی میں ادبیات فارسی و اردو کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مثنوی میں فردوسی ونظامی، قصیدہ میں خاقانی وانوری، غزل میں سعدی وحافظ، مراثی میں انیس ودبیر اور قصاید اردو میں سودا اور شیخ محمد ابراہیم ذوق کے کلام کا خوب خوب موازنہ کیا گیا ہے، لیکن مولانا روم و رودکی، اوحدی وطالب آملی، جوش ملیح آبادی اور حمید صدیقی جیسے شاعروں کے کلام کا موازنہ احقر کے لئے نہ دیدہ ہے نہ شنیدہ، موازنہ انھیں کے کلام کے مابین ہونا چاہیے جن میں کوئی خاص وصف قدر مشترک کی حیثیت رکھتا ہو۔

طرفہ یہ کہ عشق کی طولانی بحث میں اس کی دو اقسام کر کے امام احمد رضا کے عشق کو عشق حقیقی اور دیگر شعرا کے عشق کو عشق مجازی قرار دیا گیا ہے، اس تقسیم کے پیش نظر بھی کلام امام کا دیگر شعرا کے کلام سے موازنہ خدا لگتی بات نہیں ہے:

''اول تو عشق جو کیفیت دروں کا نام ہے اس کی تقسیم اس طور پر کرنا کہ ''عشق حقیقی کا اطلاق اللہ تبارک وتعالیٰ کے ساتھ، اس کے محبوب اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ یا دین اسلام اور اسلامی شخصیتوں کے ساتھ الحب للہ کے جذبۂ صادق کے تحت کیے جانے والے عشق پر ہوتا ہے۔ عشق مجازی دنیا اور دنیاداروں کے ساتھ کیے جانے والے عشق کو کہتے ہیں''۔(ص:۵۷) **غور طلب ہے**

محترم سید محمد اشرف صاحب نے اس کی وضاحت مختصر لفظوں میں یوں کی ہے کہ:

> ''ایسی عقیدت جو کسی مفاد یا مادیت پر مبنی ہو وہ عشق حقیقی نہیں ہے، عشق حقیقی میں نیت خیر، خلوص اور روحانیت کا غلبہ ہوتا ہے۔''(ص:۳۴)

غالباً سید صاحب کی نظر میں سبع سنابل شریف کی وہ حکایت رہی ہوگی جس میں ایک اجنبی نوجوان کا ایک مغل زادی سے عشق ہو گیا تھا، نوبت بایں جا رسید کہ اس صاحب جمال دوشیزہ کے ہاتھ سے نوجوان نے جیسے ہی پانی کا گلاس اپنے ہاتھ میں لیا اسی دم جاں بحق ہو گیا۔

جواباً کہا جا سکتا ہے کہ کتاب میں کلام کے داخلی محاسن یا شعر کی معنویت سے بحث نہیں ہے بلکہ فن اور اس کے مالہ و ماعلیہ کو موازنہ کی بنیاد بنایا گیا ہے جیسا کہ کتاب کے نام سے ظاہر ہے لیکن یہ عذر قابل قبول نہیں کیونکہ کتاب میں اشعار کے معانی و مفاہیم کے محاسن و معائب سے بھی بحث کی گئی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ متذکرہ بالا پیشوایان امت کے کلام سے کلام امام کا موازنہ کرنا ہمدانی صاحب کے واہمہ میں بھی نہیں آ سکتا تھا، اس کے خسران وخذلان سے وہ بخوبی واقف ہیں، دنیا میں نیک نامی کے ساتھ جینا اور عقبیٰ میں سرخرو ہو کر اٹھنا کون نہیں چاہتا، یہ وہ مرشدین برحق ہیں جن کی بارگاہ میں یوں نذرانہ عقیدت پیش کرنا زیب دیتا ہے۔

عہد ما بالب شیریں دہناں بست خدا
ما ہمہ بندہ و ایں قوم خدا و ندانند

غالباً یہی تصور محرک اور یہی خوف مانع تھا جو انہوں نے جماعت اہل سنت کے نعت گو شعرا کے کلام سے موازنہ کرنے کے بجائے ایسے غزل گو شعرا کا انتخاب کیا جن میں سے کچھ تو سرے سے ہم میں سے نہیں ہیں اور جو ہیں بھی وہ ایسے ہیں جن کی کوئی شرعی اہمیت نہیں، اسی لئے فنی اعتبار سے کلام امام کو ارفع و اعلیٰ ظاہر کرنے کے ساتھ ساتھ جگہ جگہ دیگر شعرا کی دھجیاں اڑائی گئی ہیں۔ اس ضمن میں کتاب سے ایک اقتباس پیش ہے، اس مضمون کی جا بجا عبارتیں ''فن شاعری اور حسان الہند'' میں ملاحظہ کی جا سکتی ہیں۔

ہمدانی صاحب لکھتے ہیں:

> ''حیرت کی بات تو یہ ہے کہ دیگر شعراء (غالب، شکیل، فیض، اقبال، اصغر، فانی، جگر...... شرر) شرعی قید و بند سے آزاد ہو کر عشق مجازی میں اپنے قلم کو بے لگام اور بے قابو چلانے کے باوجود اپنے کلام میں جو رنگینی و رعنائی اور حسن پیدا نہ کر سکے وہ سب حضرت رضا نے شریعت کی حد بندی میں اپنے کلام عشق حقیقی میں ایسے حسن اسلوبی سے بیان فرما دیا ہے کہ بڑے بڑے ادبا اور فصحا کے سر نیاز خم ہو گئے۔'' (ص: ۱۶۱)

ہمدانی صاحب نے حضرت رضا کو ''مظلوم مفکر'' کہا ہے جس کا ذکر ضمناً نظمی صاحب نے اپنی تقریظ میں بھی کیا ہے، اگر ان کی مراد یہ ہے کہ اغیار ہمارے امام کی عبقریت اور علمی فضیلت کا اعتراف کیوں نہیں کرتے تو کچھ تو اس کا جواب ہمدانی صاحب کے متذکرہ الفاظ، خود پلٹ کر دے رہے ہیں، بڑے بڑے ادبا اور فصحا کے سر نیاز کا خم ہونا حضرت رضا کی علمی فضیلت کا اعتراف نہیں تو اور کیا ہے؟ خیر! یہ تو جواب آں غزل تھا، سچ یہ ہے کہ ایسا ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے، علما اور صوفیہ کی بات تو الگ رہی رسولوں اور پیغمبروں تک کو مخالفوں نے تسلیم نہیں کیا، قرآن خود ناطق ہے ''و یقتلون النبیّین بغیر حق... الآیة'' اور اگر ان کی مراد یہ ہے کہ ہم اہل عقیدت بھی حضرت رضا کی دینی اور علمی خدمات کے اعتراف میں بخیل واقع ہوئے ہیں تو یہ بات ہمیں تسلیم نہیں، ادھر بیس پچیس برسوں میں جتنا لٹریچر امام احمد رضا کے تعلق سے منظر عام پر آیا ہے، اس کا عشر عشیر بھی کسی اور کے حصے میں نہیں آیا ہے، خواہ وہ علمائے شریعت ہوں یا مشائخ طریقت، اعلیٰ حضرت کی تعظیم و تکریم میں اور ان کے کمالات علمی کا چرچا کرنے میں یا ان کے پیغام کی ترسیل میں ہمارے اکابر و اصاغر نے اپنی عقیدت کو سر مو بھی ٹھیس نہیں پہنچائی ہے، ہاں! باوجود ایں ہمہ اب بھی حضرت رضا کے علم و فن کے کئی گوشے ایسے ہیں جن پر ریسرچ اور تحقیق کی ضرورت ہے، لیکن الحمد للہ! کام ہو رہا ہے تیزی سے ہو رہا ہے، ہند و پاک کے علاوہ دیگر ممالک میں بھی ہو رہا ہے، جو کچھ رہ گیا ہے ان شاء اللہ وہ بھی پورا ہو جائے گا۔

البتہ ''مظلوم مفکر'' کہنے کی ایک جائز وجہ ہو سکتی ہے، وہ یہ کہ حضرت امام کے علم و فن کی تبلیغ و ترسیل کے لئے کبھی کبھی ہم ایسا رخ اختیار کر لیتے ہیں کہ ہمارے قول کی حقانیت الفاظ کی جارحیت سے خون آلود ہو جاتی ہے، یہی نہیں بلکہ کبھی کبھی ہم ''توجیه القول بمالا یرضیٰ به القائل'' کے مرتکب ہو کر حضرت رضا کی خوشنودی سے بھی محروم ہو جاتے ہیں اور دوسروں کو ہنسنے کا موقع بھی فراہم کرتے ہیں۔ ''بیجا سے ہے المنۃ للہ محفوظ'' میں لفظ ''بیجا'' کی آسیب زدہ تشریح اور ''ارے سر کا موقع ہے او جانے والے'' کی مضحک توجیہ اس کی کھلی مثالیں ہیں، اس کی قدرے تفصیل اپنے مقام پر آئے گی، افسوس تو یہ ہے

کہ اس آخر الذکر کی تشریح کو ''فیضان رضا'' کا نام دیا گیا ہے۔

مومن و غالب دنیائے اردو ادب کے دو مستند نام ہیں اردو کی تاریخ ان اساتذۂ سخن کے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتی لیکن ہمدانی صاحب نے حضرت رضا کی عقیدت میں ان دونوں کو جس طرح بے حیثیت کرنے کی جسارت کی ہے، کیا اردو ادب کا اسکالر اسے برداشت کر سکتا ہے؟ اور کیا ادبی دنیا میں اعلیٰ حضرت کی سخن شاہی کا سکہ چلانے کے لئے ہمارا یہ طریقۂ عمل کارگر ہوسکتا ہے؟ اگر یہ سب کچھ صرف ہم خوش عقیدہ مسلمانوں کے لیے ہے تو عام ارباب علم وفن سے اس کی پذیرائی کی امید کرنا یا اُن سے صرف نظر کا شکوہ کرنا بے معنی ہے، اساتذۂ فن کو بے حیثیت کرنے کی بات کہی گئی تو ایک اقتباس کے ذریعہ اس کا ثبوت بھی فراہم کرتا چلوں، ہمدانی صاحب رقم طراز ہیں:

> ''حضرت رضا بریلوی علیہ الرحمۃ والرضوان کے نعتیہ کلام کو مذہبی اعتبار سے نہیں بلکہ فن و ادب کی حیثیت سے دیگر شعرائے اردو ادب کے کلام کے مقابلے میں جس حیثیت سے بھی لاتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ تمام شعرائے ادب وفن جمع ہو کر مجموعی طور پر فن و ادب کی جو خوبی پیدا نہیں کر سکے وہ حضرت رضا نے تن تنہا پیدا کر دی بلکہ ایک نیا حسن پیدا کر دیا ہے۔'' (ص:۱۵۹)

انہیں اساتذہ سخن کے معاصر شیخ محمد ابراہیم ذوق دہلوی بھی تھے جن کا کلام موازنہ میں شامل نہیں ہے۔ وجہ ظاہر ہے کہ اعلیٰ حضرت نے انہیں ''مرحوم ذوق دہلوی'' لکھ دیا ہے اس لفظ ''مرحوم'' کا اثر یہ ہوا کہ خاقانی ہند کی جاں بخشی ہوگئی، حکیم مومن خاں مومن کی ولادت کے بعد اگر چہ ان کے کان میں شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اذان دی تھی اور مومن نام بھی انہیں کا تجویز کردہ ہے لیکن سن شعور کو پہنچنے کے بعد یہ سید احمد رائے بریلوی اور مولوی محمد اسماعیل دہلوی کے حلقۂ اثر میں شامل ہو گئے تھے، غالب تو شرابی کبابی اور جواری تھے ہی، اس لئے ان دونوں کی یا فساق شعرا کی جس قدر تحقیر و تذلیل کی جائے مضائقہ ندارد، مگر ہمیں یہ بات نہیں بھولنی چاہیے کہ علم وفن کا اعتراف

اور عقیدہ و عمل کا احتساب دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ رسول اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے جاہلی شاعر امرء القیس کو **اشعر شعراء العرب** بھی فرمایا ہے اور **حامل لوائهم الی النار** بھی، پہلا جملہ امرء القیس کے فن کا تعارف ہے اور دوسرا جملہ اس کی ضلالت فکر و عمل پر مہر، اس لئے جہاں فن شاعری کے تعلق سے موازنہ کیا جائے وہاں موضوع کے ساتھ انصاف کرنا چاہئے۔

حیرت تو یہ ہے کہ نظمی صاحب نے ''مظلوم مفکر'' پر جو اپنوں کی طرف سے ظلم ہوا ہے اس کا سارا الزام اہل بریلی کے سر تھوپ دیا ہے، لکھتے ہیں:

> ''اعلیٰ حضرت کے اپنے خاندان میں ان کا چرچا بہت کم ہے، بریلی شریف سے رسالہ نکلتا ہے ''اعلیٰ حضرت''، سچ بتایئے اعلیٰ حضرت پر کتنے مضمون اس میں شامل کیے جاتے ہیں اور جو مضمون کبھی کبھار آتے بھی ہیں ان میں اعلیٰ حضرت کی شخصیت اور ان کے دینی علمی کارناموں کا کیا تناسب ہوتا ہے تو کیا ہمدانی صاحب نے لفظ ''مظلوم'' درست نہیں لکھا؟ (عرفان رضا، ص: ۱۴)

اعلیٰ حضرت کے خاندان میں ان کا چرچا کم ہو یا زیادہ پوری دنیائے سنیت میں ہر طرف ان کا چرچا ہو رہا ہے اور ایسا ہو رہا ہے کہ صدر اسلام سے آج تک جس فرقہ کو فرقۂ ناجیہ ہونے کا افتخار حاصل ہے اسے فی زماننا ''مسلک اعلیٰ حضرت'' سے جانا جاتا ہے، ویسے یہ بات کلیتاً ''سیاست زدہ'' معلوم ہوتی ہے کہ اعلیٰ حضرت کے خاندان میں ان کا چرچا بہت کم ہے، نہ جانے ایسا بے بنیاد جملہ نظمی صاحب کے قلم سے کیسے نکل گیا۔

ہمدانی صاحب حضرت رضا کی چہار لسانی نعت کی تعریف میں سوز و گداز اور ربط و روانی کا ذکر کرتے ہوئے یہ کہنا نہیں بھولے کہ ''علم عروض اور اصول تقطیع کے مطابق ہر شعر وزن میں پورا ہے، نہ کہیں سکتہ ہے اور نہ کہیں انقطاع'' گویا یہ بھی حضرت رضا کا کمال ہے کہ ان کے اس چہار لسانی کلام میں علم عروض اور اصول تقطیع کی بھی بھرپور

رعایت ہے، کسی مکان کی تعریف یوں تو کی جاسکتی ہے کہ معمار نے اس کو بہت خوبصورت بنایا ہے، دیوار کو منقش کر کے جاذب نظر بنادیا ہے چھت کی گلکاری آنکھوں کو خیرہ کرتی ہے لیکن یہ بھی کوئی بات ہوئی کہ سبحان اللہ اس مکان میں دیوار بھی ہے، چھت بھی ہے اور تو اور دروازوں کے پلے بھی ٹھیک سے کھلتے اور بند ہوتے ہیں۔

ہمدانی صاحب نے ایک توجہ طلب بات اور کہی ہے جس پر میں علمائے کرام کا عندیہ جاننا چاہوں گا لکھتے ہیں:

> ''قرآن مجید میں جن اشعار کی مذمت کی گئی ہے اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے جن اشعار کے صدور کی نفی کی گئی ہے ان اشعار سے مراد وہ اشعار ہیں جو کذب بیانی اور لغویات پر مشتمل ہیں۔'' (ص:۷۷)

اس کے بعد لکھتے ہیں:

> ''۸ھ جنگ حنین (ہوازن) کے دن حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اپنے بغلۂ بیضا پر سوار تھے اور کفار پر اپنی عظمت کا اظہار فرماتے ہوئے رجزأیہ شعر ارشاد فرمارہے تھے ؎

انا النبی لا کذب

انا ابن عبد المطلب

(ص:۷۷)

دونوں عبارتوں کو پڑھنے کے بعد یہ تأثر قائم ہوتا ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے شعر کہا ہے اور اگر ماسبق حوالہ کے جانب مخالف مفہوم کا اعتبار کیا جائے تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسے اشعار کا صدور تسلیم کرنا صحیح ہوگا جو کذب بیانی اور لغویات سے پاک ہوں، یہاں علماء کرام سے دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ مذکورہ بالا دو مقفیٰ جملے جو موزوں بھی ہیں اور یقینا حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے ادا ہوئے ہیں، کیا اس مجموعۂ الفاظ کو اصطلاحاً شعر کہنا جائز ہے؟ اسی کے ساتھ یہ بھی پوچھنا

چاہتا ہوں کہ قرآن مقدس کی آیۃ کریمہ کے یہ الفاظ جو مقفیٰ بھی ہیں اور موزوں بھی، کیا اس پر بھی شعر کا اطلاق جائز ہوگا؟

الذی انقض ظھرک

ورفعنا لک ذکرک

ایسا تو نہیں کہ کوئی برجستہ جملہ جو مقفیٰ بھی ہو اور موزوں بھی ہو گیا ہو لیکن شعر کہنے کا قصد نہ کیا گیا ہو ایسے جملوں پر علمائے فن شعر کا اطلاق نہ کرتے ہوں؟ کچھ تو میں اپنی معلومات کے مطابق عرض کیے دیتا ہوں، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے قول:

انا النبی لا کذب

انا ابن عبد المطلب

پر شعر کا اطلاق صحیح نہیں ہے کیونکہ یہ جملے شعر کہنے کے قصد وارادہ سے ادا نہیں کیے گئے ہیں یہ اور بات کہ دونوں جملے وزن میں برابر اور مقفیٰ ہیں، المواھب الدنیۃ میں ہے۔

”و اما قولہ صلی اللہ علیہ وسلم ۔“

انا النبی لا کذب انا ابن عبد المطلب: فقد قال العلماء انہ لیس بشعرٍ لان الشاعر انما سمی شاعراً لوجوہ منھا انہ اشعر القول و قصدہ واھتدی الیہ واتی بہ کلاماً موزوناً علی طریقۃ العرب مقفیً فان خلا ھذہ الاوصاف اوبعضھا لم یکن شعراً ولا یکون قائلہ شاعراً والنبی صلی اللہ علیہ وسلم لم یقصد بکلامہ ذالک الشعر ولا ارادہ فلا یعد شعراً و ان کان موزوناً (ج:۱،ص:۶۰۳)

واضح ہو کہ اس کتاب کو محترم مولانا عبدالستار ہمدانی صاحب نے نہایت اہتمام کے ساتھ شائع کیا ہے۔ اسی طرح قرآن مقدس کی آیت شریفہ ”الذی انقض ظھرک و رفعنالک ذکرک“ پر بھی شعر کا اطلاق جائز نہیں ہے اگر چہ یہ جملہ بھی موزوں اور مقفیٰ ہے۔ علامہ میر سید شریف جرجانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

”الشعر فی الاصطلاح کلام موزون علی سبیل القصد

والقید الاخیر یخرج نحو قولہ تعالیٰ الذی انقض ظھرک ورفعنالک ذکرک فانہ کلام موزون مقفیً لکن لیس بشعرٍ لان الاتیان بہ موزوناً لیس علی سبیل القصد"۔

(کتاب التعریفات،ص:۵۶،مطبوعہ مصر)

اس لئے ہمدانی صاحب کا قول:حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم رجزاً یہ شعر ارشاد فرما رہے تھے(ملخص)بڑی جسارت ہے اور اسلامی نظریہ کے خلاف ہے۔

خامہ کس قصد سے اٹھا تھا

صنعت لف ونشر:

یہ صنعت شاعری میں کثیر الاستعمال ہے اس میں شاعر مصرع اول میں چند چیزیں بیان کرتا ہے پھر ترتیب سے دوسرے مصرع میں ان کے مناسبات کا ذکر کرتا ہے اسے لف ونشر مرتب کہتے ہیں اور اگر ترتیب قائم نہیں رہی تو یہ لف ونشر غیر مرتب ہے حدائق بخشش میں دونوں ہی قسموں کی مثالیں ملتی ہیں جیسے:

(مرتب کی مثال)

دندان و لب و زلف و رخ شہ کے فدائی
ہیں درعدن لعل یمن مشک ختن پھول

(غیر مرتب کی مثال)

دل بستہ بے قرار جگر چاک اشکبار
غنچہ ہوں گل ہوں برق تپاں ہوں سحاب ہوں

ہمدانی صاحب لکھتے ہیں:"اس صنعت میں شعر کہنا کوئی مشکل یا دشوار امر نہیں ہے اسی وجہ سے تمام شعراء نے اس صنعت میں طبع آزمائی کی ہے۔"(ص:۱۷۹)اس کے بعد مصنف نے غالب،اصغر،جگر،شکیل،تاباں اور فانی کے اشعار مثالاً پیش کیے ہیں جن میں سے بیشتر کا تعلق نہ لف ونشر مرتب سے ہے نہ غیر مرتب سے،اس غلط فہمی کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ یہ دعویٰ کر بیٹھے کہ" حضرت رضا کے کلام میں صنعت لف ونشر کے اشعار اتنی کثرت سے پائے جاتے ہیں کہ ان تمام اشعار کو الگ چھانٹ کر شمار کرنا بہت ہی مشکل امر ہے لہٰذا ہم چند اشعار ناظرین کی فرحت طبع

کے لئے پیش کرتے ہیں۔" (ص:۱۸۱) اس کے بعد دس اشعار اس صنعت کے تعلق سے پیش کیے گئے ہیں ان میں سے ایک دو شعر کے علاوہ کسی کا تعلق اس صنعت سے نہیں ہے۔ ظاہر ہے جو ایک دو شعر لف ونشر کی مثال میں ٹانک دیے گئے ہیں یہ محض اتفاق ہے اس ضمن میں جو مثالیں دی گئی ہیں ان میں سے چند یہ ہیں:

غالب:

حیراں ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں
مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو میں

شکیل

گلچیں نے تو کوشش کر ڈالی سونی ہو چمن کی ہر ڈالی
کانٹوں نے مبارک کام کیا پھولوں کی حفاظت کر بیٹھے

امام احمد رضا

یہ شمس و قمر یہ شام و سحر یہ برگ و شجر یہ باغ و ثمر
یہ تیغ و سپر یہ تاج و کمر یہ حکم رواں تمہارے لئے

لطف کی بات یہ ہے کہ لف ونشر (مرتب) کی جو کھلی ہوئی مثال تھی اس کے بارے میں لکھتے ہیں کہ: اردو ادب میں صنعت مقابلہ میں یہ شعر اپنی مثال آپ ہے۔

دندان و لب و زلف و رخ شہ کے فدائی
ہیں در عدن لعل یمن مشک ختن پھول

اسی سلسلۂ بیان کو یوں آگے بڑھایا ہے: "حضرت رضا کی نعتیہ شاعری میں مقالہ قلم بند فرمانے والے اہل قلم کی اکثریت اس شعر کو صنعت تشبیہ میں شمار کرتی ہے اور اس شعر کو صنعت مقابلہ کے تحت شمار نہیں کیا، میں ان تمام اہل قلم کا خادم، ان کا سوالی، ان کا طفیلی ہونے کے ناطے ان کی خدمت عالی میں مؤدبانہ گزارش کرتے ہوئے اپنی ناقص رائے کا اظہار کرنے کی جرأت کرتا ہوں کہ یہ شعر صنعت مقابلہ میں زیادہ موزوں ہے۔" (ص:۱۶۹۔۱۶۸) اس کے علی الرغم حضرت رضا کی بارگاہ کا بھکاری شرر مصباحی عرض کرتا ہے کہ جن مقالہ نگاروں نے اس کو صنعت تشبیہ میں شمار کیا

ہے یا ان مقالہ نگاروں کے طفیلی نے اسے صنعت مقابلہ میں گردانا ہے اور صنعت لف ونشر سے رو گردانی کی ہے ان حضرات کی تشبیہ، مقابلہ اور لف ونشر کے صحیح مفہوم تک رسائی نہیں ہے۔ اول تو خالص معانی و بیان کی اصطلاحات کے ساتھ لفظ ''صنعت'' کا استعمال محل نظر ہے (گو بعض اساتذہ نے بھی استعمال کیا ہے) دوسرے یہ کہ تشبیہ کے لئے ضروری نہیں کہ اس کا مشبہ بہ دوسرے مصرع میں ہو مصرع اول میں بھی تشبیہ کے ارکان جمع ہو سکتے ہیں جیسے

اے رخت ہمچو آفتاب منیر......

یا

میان لاغر تو بے نشان چو اسم وفا
دہان تنگ تو نایاب ہمچو کام جہاں

اور تقابل میں وحدت ہشت گانہ یا اس کی اقسام تقابل تضاد، ایجاب وسلب وغیرہ کی تفصیل سے حذر کرتے ہوئے صرف تعریف اور مثالوں سے واضح ہو جائے گا کہ صنعت مقابلہ کے اشعار کس نوع کے ہوتے ہیں۔

تعریف:

ایک کلام کے مقابل دوسرا کلام اس طرح سے ہو کہ چند الفاظ یا کل باہم تضاد رکھتے ہوں جیسے ذوق دہلوی ۔

خیر خواہوں کے ترے چہرے پہ ہو رنگ نشاط
اور بدخواہوں کے رخسار پہ اشک حسرت

ہمدانی صاحب نے صنعت تضاد کا علیحدہ ذکر کیا ہے سکا کی کا موقف یہی ہے، لیکن تلخیص اور مطول میں اسے صنعت تضاد ہی قرار دیا گیا ہے۔ اب متذکرہ لف ونشر کی تعریف نگاہ میں رکھتے ہوئے شعر پر غور کیجئے تو یہ شعر لف ونشر مرتب کی بہترین مثال قرار پائے گا، علاقہ تشبیہ لف ونشر کے لئے مانع نہیں ہے۔

اب چند بوالعجبیاں بھی ملاحظہ کرتے چلئے، ہمدانی صاحب لکھتے ہیں:

''اگر اس شعر کو صنعت تشبیہ میں شمار کرتے ہیں جب بھی صحیح ہے اور اس صورت میں شعر کے معنی یہ ہوں گے: اے میرے آقا و

مولیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دندان، لب، زلف اور رخ پہ فدا ہونے والے عاشق تو جس دندان شریف پر فدا ہورہا ہے وہ دندان (دانت) درعدن یعنی عدن کے موتی ہیں، تو جس مقدس لب پر فدا ہورہا ہے وہ لب لعل یمن یعنی ملک یمن کے لعل ہیں، تو جس زلف پر فدا ہورہا ہے وہ زلف معنبری مشک ختن یعنی ملک ختن کا نافہ ہے۔ (کسی ملک کا نافہ پوری حدود مملکت کا درمیانہ حصہ ہوتا ہے۔ شرر) اور تو جس رخ انور پر فدا ہورہا ہے اس رخ انور کی نزاکت کا یہ عالم ہے کہ وہ پھول ہے"۔ (ص: ۱۷۰)

اس کے بعد ٹیپ کا بند ملاحظہ ہو:

"حضرت رضا بریلوی علیہ الرحمۃ والرضوان عشق رسول کی اس اعلیٰ منزل میں پہنچ چکے تھے کہ حضرت رضا بریلوی جب بھی اپنے آقا و مولیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جسم اقدس کے کسی عضو شریف یا آپ کی کسی صفت کو کسی چیز سے تمثیل دیتے تو مثال میں ایسی چیز ہی کو بیان کرتے کہ اس سے بہتر کوئی چیز نہ ہوتی"۔ (ص: ۱۷۰)

اقتباسات کی مہربانی سے مضمون طویل ہوتا جارہا ہے اس لئے اس سلسلہ میں جو عدن کے موتی یمن کے لعل اور ختن کے مشک کی تفصیل بیان کی گئی ہے اس پر تبصرہ سے احتراز کرتے ہوئے عرض ہے کہ شعر کی یہ تشریح فاضل بریلوی کے فکر و مزاج کے بالکل برخلاف ہے، بلکہ سراسر الزام ہے، فاضل بریلوی اپنی مثنوی ردامثالیہ میں فرماتے ہیں (غیر ضروری اشعار چھوڑ دیے گئے ہیں)

لعل باشد زیب تاج سروراں
زینت و خوبی گوش دلبراں
مشک اذفر روح را بخشد سرور
ہمچو بوئے سنبل گیسوئے حور
شامہ از بوئے او رشک جناں

ہم معطر زو قبائے مہ وشاں
ہے چہ گفتم ایں چنیں شبہ شنیع
کے بود شایان آں قدر رفیع
لعل چبُود جوہرے یا سرخیے
مشک چبُود خون ناف و حشیے

فاضل بریلوی فرماتے ہیں کہ:

''حضرت اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی شان رفیع کے لئے لعل اور مشک کی تشبیہ کیوں کر صحیح ہوسکتی ہے لعل صرف ایک سرخ پتھر ہے، اور مشک ایک وحشی جانور کے نافہ کا خون بستہ ہے۔''

فاضل بریلوی کی اس صادق البیانی کے بعد ہمدانی صاحب کا سارا زور، سارا طومار دشنۂ فرہاد برسر فرہاد حضرت رضا کا دامن اس داغ دھبے سے پاک۔

صنعت مسمط:

ہمدانی صاحب نے ''صنعت مسمط'' کی تعریف فیروز اللغات سے نقل کر کے اس کی ژولیدہ عبارت میں الجھ کر کتاب کے سات سے زائد صفحات سیاہ کرڈالے ہیں اس پر طرہ یہ کہ ''حضرت رضا کا صنعت مسمط میں عظیم شاہکار'' کی سرخی قائم کر کے عقیدت کے گل بھی کھلائے ہیں اور نامور شعرا کے لئے منھ کھولنے سے باز بھی نہیں آئے ہیں، لکھتے ہیں ''صنعت مسمط'' کی مثال میں اردو ادب کے شہرۂ آفاق اور نامور شاعروں کے دیوان سے کوئی غزل پیش کرنے کے لئے ہم نے ان شاعروں کے دیوان کی گہری نظر سے اوراق گردانی کی تو محسوس ہوا کہ ہم کسی صحرا میں میٹھے پانی کے چشمہ کی جستجو میں بھٹک رہے ہیں، بڑی مشکل سے جگر مرادآبادی اور شکیل بدایونی کے کلام میں غیر تسلی بخش مثالیں نظر آئیں'' کچھ آگے یوں زبان قلم گویا ہوئی ہے:

''حضرت رضا بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کے دیوان سمندر عشق کی موجیں صنعت مسمط جیسی کئی صنعات کے گوہر شاداب کے ہمراہ خود پیش قدمی کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔'' (ص:۲۱۹)

اس کے بعد حضرت رضا کی ایک نعت میں ۱۷/اشعار مسمط کے ایک نعت میں ۲۵/اور

ایک نعت میں ۲۷/۲/اشعار مسمط کی صنعت میں تحریر کیے ہیں حتی کہ ''لم یات نظیرک فی نظر'' کے کل ۱۰۱اشعار میں سے ۹۱اشعار کو صنعت مسمط میں شمار کیا ہے۔ سچ کہا ہے کہنے والے نے۔

خشت اول چوں نہد معمار کج

تا ثریا می رود دیوار کج

اب فاضل مصنف کو کون بتائے کہ صنعت مسمط کا وجود کسی مصرع یا شعر کے ٹکڑوں سے نہیں ہوتا بلکہ پوری نظم کی ایک خاص ہیئت پر اس کا اطلاق ہوتا ہے اس لئے یہ کہنا کہ فلاں نعت میں اس صنعت کے ۱۷۔ یا ۲۵۔ یا ۱۲۷اشعار صنعت مسمط میں پائے جاتے ہیں بالکل لغو اور مہمل بات ہے۔

نسیم البلاغت سے صنعت مسمط کی تعریف اور چند اشعار فہم مطالب کے لئے پیش کیے جاتے ہیں۔

''چند مصرع ایک وزن ایک قافیہ میں کہے جائیں اور اسی وزن کے کئی بند کہہ کر ہر ایک بند کا قافیہ پہلے بند کے خلاف رکھا جائے اگر ان بندوں کے مصرع طاق ہوں تو آخری مصرع کا قافیہ ہر بند میں وہی رکھیں جو پہلے بند کا تھا اور اگر جفت ہوں تو آخر کے دو مصرعوں کا کبھی وہی قافیہ رکھتے ہیں جو اوپر والے مصرعوں کا تھا اور کبھی بدل دیتے ہیں، مسمط کی کئی قسمیں ہیں جس میں مثلث، مخمس اور مسدس اردو میں زیادہ رائج ہیں صاحب معیار نے ترجیع بند اور ترکیب بند کو بھی مسمط ہی میں محسوب کیا ہے۔

مسمط مثلث:

وہ مسمط ہے جس کے ہر بند میں تین مصرع ہوں مطلع کے مصرعوں کا ایک قافیہ (یعنی تینوں ہم قافیہ ہوں ......شرر) اور باقی بندوں میں شروع کے دو مصرعے ایک قافیہ میں ہوں اور تیسرا مصرع اسی قافیہ میں ہو جس میں مطلع تھا۔ مثال:

برقع جو اپنے منہ سے صنم نے اٹھا دیا

سب کو خدا کے نور کا جلوہ دکھا دیا

سجدے کو مہر و ماہ نے بھی سر جھکا دیا

یوسف کا حسن قصہ پارینہ ہوگیا
دل اس کے عکس نور سے آئینہ ہوگیا
قامت نے اس کے فتنۂ محشر جگا دیا

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ہر بند میں ایک ہی مصرع لاتے ہیں، جیسے

دنیا ہے سرا اس میں بیٹھا تو مسافر ہے
اور جانتا ہے یاں سے جانا تجھے آخر ہے
کچھ راہ خدا دے جا جا تیرا بھلا ہوگا

جو رب نے دیا تجھ کو تو نام پہ دے رب کے
گریاں نہ دیا تو نے کیا دیوے گا واں بندے
کچھ راہ خدا دے جا جا تیرا بھلا ہوگا

مسمط کی اس تعریف اور مثال سے یہ ظاہر کرنا تھا کہ ہمدانی صاحب نے اس صنعت کے تعلق سے جو کچھ لکھا ہے صرف اندھیرے میں تیر مارا ہے۔

اس صنعت کی دیگر اقسام یا تفاصیل کے لئے متداول کتب سے رجوع کیا جائے۔

خط توأم:

خط توأم کی جو تشریح کی گئی ہے اس پر پاکستان کے بعض رسائل میں مصنف کو خوب خوب داد تحقیق دی گئی ہے جس سے ہماری الجھنیں اور بڑھ گئیں، ہمدانی صاحب نے خط توأم کے لغوی معنی بیان کرنے کے لئے فیروز اللغات کا سہارا لیا ہے لیکن یہ اعجوبہ بیانی حوالہ کے بغیر ہے، خط توأم کی جو تفصیل بیان کی گئی ہے وہ اس طرح ہے کہ ''خط توأم اس خط کو کہتے ہیں جس کے ذریعے عاشق و معشوق کے درمیان نازک ترین معاملات اور عشق و محبت کے راز اور پیغام ایک دوسرے تک پہنچاتے ہیں علاوہ ازیں ملکی فوجی سیاسی اور حکومت سے تعلق رکھنے والے اور دیگر نوعیت کے اہم اور

خفیہ راز اور احکام وفرامین بھی اس خط کے ذریعہ پہنچائے جاتے ہیں۔

مثال: صفحہ اول

ا	2	3	4	5	6
م	خ	ا	م	ک	ھ
ب ب	ن	ت ا	ن	م ا	ا

صفحہ دوم

ا	2	3	4	5	6
ح	ا	م	ی	ا	و
و	ح ن			ی ب	

وضاحت:

اس کو حل کرنے کی ترکیب یہ ہے کہ صفحہ اول اور صفحہ دوم میں خط کا مضمون دو حصوں میں لکھا ہوا ہے دونوں مضمون پر نمبر ا سے نمبر ۶ تک کے کل چھ الفاظ ہیں اس کو حل کرنے کے لئے یہ قاعدہ ہے کہ ہر لفظ کا پہلا حرف صفحہ اول سے لیا جائے اور دوسرا حرف صفحہ دوم سے لیا جائے اب حل کی صورت یہ ہوگی۔

صفحہ اول

م ح	خ	ام ت	م	ک ام	ھ
ب و ب	ان	ح ان	ی ن	ی اب	وا
محبوب	خان	امتحان	میں	کامیاب	ہوا

اسی طرز خط توأم میں حضرت رضا بریلوی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک ایمان افروز مثال پیش کی ہے جو درج ذیل ہے۔

ایک سینہ سے مشابہ اک وہاں سے پاؤں تک\
حسن سبطین ان کے جاموں سے ہے نیا نور کا\
صاف شکل پاک ہے دونوں کے ملنے سے عیاں\
خط توأم میں لکھا ہے یہ دو ورقہ نور کا"

(ص:۲۴۰)

مصنف نے خط توأم کی وضاحت کرتے ہوئے جو مثال پیش کی ہے اگر یہی خط توأم ہے تو یہاں تو سر سے پاؤں تک کا الٹ پھیر ہے یا دونوں صفحوں کو الگ متوازی رکھئے تو اعلیٰ و اسفل کا کوئی تصور ہی نہیں ہوتا پھر اس سے نصف اعلیٰ اور نصف اسفل کی تشبیہ میں تو ادنی ملابست بھی نہیں پائی گئی۔ نیز اس تشریح کی بنیاد پر صفحہ اول اور صفحہ دوم کو مربوط کیے بغیر دونوں صفحوں کا وجود و عدم برابر ہے، یا یوں کہئے کہ دونوں صفحے علیحدہ علیحدہ لغو اور مہمل ہیں۔ درحقیقت ہمدانی صاحب کو خط توأم کا مفہوم سمجھنے میں سخت غلط فہمی ہوئی ہے وہ خط کو مضمون اور مکتوب کے معنی میں سمجھ بیٹھے ہیں جب کہ خط توأم خوش نویسی کی ایک قسم ہے جیسے خط غبار، خط گلزار، خط رنگین، خط شفیعا وغیرہ اسی لئے شعرا کے کلام میں جہاں ان خطوط کا ذکر ملتا ہے وہاں مضمون سے کوئی سروکار نہیں ہوتا بلکہ صرف ان کی مخصوص رسم کتابت اور ہیئت کا اظہار مقصود ہوتا ہے مثلاً۔

خط غبار:-

عیاں ہے آئینہ رخ پہ جب سے خط غبار
وہ خط ہیں لکھتے مگر در خط غبار مجھے

خط گلزار:-

سبزۂ خط گل رخسار پہ اک عالم ہے
خط ریحان خط گلزار نظر آتا ہے

خط طغرا:-

کوچۂ خلد نظر آنے لگا دنیا میں
خوب فردوسیہ لکھا ہے خط طغرا میں

خط شفیعا:-

ریش مرسل کو نبوت کا رسالہ کہئے
کشش خط شکست دل اعدا کہئے
سر فرمان خدا کا خط طغرا کہئے
کلک تحریر کا یا خط شفیعا کہئے

راقم الحروف نے خط توأم کے کئی نمونے دیکھے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ دونہایت باریک کاغذ لیے جاتے ہیں اور دونوں صفحوں پر کچھ بیل بوٹے بنادیئے جاتے ہیں یاباریک قلم چلا دیا جاتا ہے پھر جب دونوں صفحوں کوملادیا جاتا ہے تواوپر نیچے کے بیل بوٹوں یا ہلکی لکیروں کے بیچ میں سفید حصہ بالکل نمایاں ہوجاتا ہے اور صاف پڑھا جاتا ہے، یہاں حضرت رضا نے خط توأم کے لفظ سے اسی کا استعارہ کیا ہے اس سے اعلیٰ واسفل کا مفہوم مراد بھی حاصل ہوگیا اور اعلیٰ واسفل کے بیل بوٹے اور لکیریں لغو اور مہمل بھی قرار نہیں پائیں، تشبیہ کے لئے اتنی ملابست کافی ہے۔ خط توأم فارسی کے مشہور خوش نویس ابن مقلہ ہراتی کی ایجاد بتائی جاتی ہے، ذوق دہلوی نے بھی ایک شعر میں اس خط کی رسم کتابت سے استفادہ کیا ہے۔

خط توأم میں لکھو گور میں تاریخ وصال
کہ رہی وصل کی تا مرگ تمنا ہم کو

ہمدانی صاحب کی یہ اپج کہ اس خط کے ذریعہ عشق ومحبت کے خفیہ راز اور ملکی، فوجی، سیاسی اور حکومت کے اہم اور خفیہ راز الخ۔ یہ سب ہوائی باتیں ہیں حقیقت سے ان کا دور کا بھی تعلق نہیں ہے۔

بیجا سے ہے المنۃ للہ محفوظ:

ہمدانی صاحب بحوالۂ فیروز اللغات لکھتے ہیں:

''بیجا ایک ڈراؤنی شکل کا کاغذی چہرہ جسے بچے منہ پر رکھ کر ڈراتے ہیں''۔

اس کے بعد شعر کی تشریح یوں کی ہے:

''میں اپنے کلام سے مسرور ہوں کیونکہ اس راہ میں جو ڈراؤنی صورت پیش آتی ہے اس سے اللہ کا شکر ہے کہ میں حفاظت کیا گیا ہوں''۔

(ص:۲۹۹)

رباعی کے اس مصرع میں لفظ ''بیجا'' ہمیشہ یائے مجہول سے (بے جا) پڑھا جاتا رہا ہے اور اس کے مفہوم کی وسعت کو دیکھتے ہوئے ذہن کا تبادر کسی اور تلفظ کی طرف ہونا بھی نہیں چاہئے لیکن ہمدانی صاحب نے کچھ نیا کردکھانے کے شوق میں یہاں بھی گل کھلا دیا، حضرت امام کی اس رباعی کا مفہوم بالکل واضح ہے کہ ان کا کلام بے جا یعنی فضول، نازیبا اور نامناسب باتوں سے پاک ہے ایسا اس لئے ہے کہ انہوں نے نعت گوئی قرآن کریم سے سیکھی ہے۔

ہمدانی صاحب نے ''بیجا'' (بی جا) جیسے نامانوس اور متروک الاستعمال لفظ کے معنی لغت سے دیکھ کر اس سے استفادہ کرتے ہوئے بے جا کے حقیقی معنی کو نظر انداز کر دیا ہے جو کسی طرح بھی درست نہیں ہے۔

اول تو نعت گوئی کی راہ میں ڈراؤنی صورت کا آنا بے معنی بات ہے، چلہ کرنے کے دوران البتہ سنا گیا ہے کہ آخری دنوں میں کچھ ڈراؤنی صورتیں سامنے آتی ہیں، جو لوگ یکسوئی کے ساتھ وظیفہ میں مشغول رہتے ہیں اور جن کے سر پر مرشد کا ہاتھ ہوتا ہے وہ اس بلائے ناگہانی سے محفوظ رہتے ہیں لیکن نعت گوئی کی راہ میں ڈراؤنی صورت بھی پیش آتی ہے؟ ہم نے آج تک کسی نعت گو سے ایسا نہیں سنا، ہم نے خود بھی بفضلہ تعالیٰ نعتیہ اشعار کہنے کی سعادت حاصل کی ہے مگر ہمیں کبھی کوئی مہیب صورت ڈرانے نہیں آئی۔ دوسرے یہ کہ لفظ ''بیجا'' (بی جا بیائے معروف) کے بارے میں اتنا ملتا ہے کہ جیم معجمہ سے اس کا کبھی چلن تھا اس سلسلہ میں رنگین کے ایک شعر کا حوالہ بھی دیا جاتا ہے لیکن انشاء اللہ خاں انشا اور ان کے بعد کے شعرا کی زبانوں پر یہ لفظ ''بیچا'' (جیم فارسی سے) رہا ہے چند لغات کے حوالے ملاحظہ ہوں۔

نوراللغات:- بیچا (بیائے معروف) کاغذ یا کپڑے کی مصنوعی ڈراؤنی صورت بچوں کے ڈرانے کے لئے ایک ہیبت ناک صورت بنا دیتے ہیں اس کو ہوّا بھی کہتے ہیں۔

کالے کاغذ کی مگر ایک کتر کر بیچا
زاہد بزم کے منھ پر تو لگا سکتے ہیں

مہذب اللغات:- بیچا (بیائے معروف) مٹی یا دفتی کی بنی ہوئی مہیب شکل۔

گلگیر کلموہا موا بیچا کی شکل ہے
بچوں کی طرح روئے نہ کیوں بار بار شمع

سرمایۂ زبان اردو:- بیچا اس صورت سے عبارت ہے جو لڑکوں کے ڈرانے کے واسطے بناتے ہیں کہ لڑکے اسے دیکھ کر ڈرتے ہیں اور بھاگتے ہیں

فرہنگ آصفیہ: بیچا (معنی مذکور)

ہم تو ہنستے نہیں پر آپ کے ہنسنے کے لئے

اور اگر سانگ نہیں کوئی بنا سکتے ہیں
کالی کاغذ کی ابھی ایک کتر کر بیچا
زاہد بزم کے منھ پر تو لگا سکتے ہیں

لغت کی کتابیں چونکہ ادبی اور لسانی اثاثہ کی محافظ ہوتی ہیں اس لئے لغت میں یہ لفظ دونوں طرح سے ملتا ہے۔ بہر حال حضرت امام احمد رضا کے دور میں بیجا (بی جا جیم معجمہ سے) متروک الاستعمال تھا اور بیچا (جیم فارسی سے) اگر چہ فصیح و رائج ہے لیکن ''بیجا سے ہے المنۃ للہ محفوظ'' میں لفظ (بے جا) یائے مجہول سے فضول، نازیبا اور نامناسب کے معنی میں ہی متعین ہے۔

''ارے سر کا موقع ہے او جانے والے'':

ہمدانی صاحب نے اس مصرع پر ایک اعتراض کا جواب دیتے ہوئے بڑی مضحک بات کہی ہے افسوس کہ یہ سات صفحات سے زائد پر مشتمل تحریر کا اختصار بھی ایک صفحہ سے کم نہ ہوگا جو خود میرے لئے گراں خاطر ہے مگر مجبوری ہے، ہمدانی صاحب مدینہ منورہ سے واپسی پر جدہ تشریف لاکر اپنے برادر طریقت جناب شوکت حسین صاحب نوری کے دولت کدہ پر فروکش ہوئے جہاں روزانہ علمی محفل جمتی تھی وہیں ہمدانی صاحب کی ملاقات شیخ بدر الدین صاحب سے ہوئی جن کا جدہ میں وسیع حلقہ ہے، شیخ موصوف کو ایسے افراد سے سابقہ پڑتا رہتا ہے جو حضرت امام احمد رضا سے بغض رکھتے ہیں اور اعتراض کی بھر مار کرتے ہیں، شیخ بدر الدین نے ایسے کئی اعتراض کا ذکر ہمدانی صاحب سے کیا اور معقول جواب طلب فرمایا، ان میں سے ایک اعتراض یہ تھا۔

حرم کی زمیں اور قدم رکھ کے چلنا
ارے سر کا موقع ہے او جانے والے

اعتراض یہ تھا کہ اس شعر میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین کی گئی ہے، زائرین مدینہ کو جانوروں کی ہیئت تعلیم کی جارہی ہے، اگر کوئی شخص کسی حاکم سے ملنے کے لئے سر کے بل چلے تو یہ حاکم کے دربار کی بے عزتی ہے، ہمدانی صاحب نے جواب دیا کہ اردو زبان میں سر کے بل چلنا اور سر سے چلنا محاورہ ہے جو بے حد تعظیم و تکریم کے موقع پر بولا جاتا ہے لیکن اعتراض برائے اعتراض کا سلسلہ قائم رکھتے ہوئے ایک نیا شوشہ نکالا گیا کہ ہمدانی صاحب جو شخص محاورے سے واقف

نہیں اور مدینہ شریف میں سر کے بل چلے تو کیا حشر ہوگا، ایام حج میں تو ہنگامہ برپا ہو جائے گا اب بات بڑے نازک موڑ پر آ گئی تھی، ہر چند سمجھانے کی کوشش کی گئی لیکن ہمدانی صاحب کی ایک بھی نہ سنی گئی بس یہی اصرار رہا کہ جانوروں کی ہیئت سکھائی جا رہی ہے، ہمدانی صاحب نے اس پریشانی کے عالم میں امام احمد رضا سے استغاثہ کیا، فیضان رضا جاری ہوا اب ہمدانی صاحب معترض سے مخاطب ہوئے کہ عشق کے جو دو مقام ہیں مقام ادب اور مقام فنا ان میں کس کا درجہ بلند ہے؟ جواب ملا مقام فنا کا، ہمدانی صاحب نے خدا کا شکر ادا کیا کہ گو کہ یہ شعر مقام ادب میں ہے لیکن اب اس شعر پر اعتراض عائد ہوا ہے لہٰذا اب یہ شعر مقام ادب سے نکل کر مقام فنا کا شعر ہو گیا اور اب خلاصۂ مطلب یہ ہوا کہ اے مدینہ کے زائر کیا یہی ترے عشق کا تقاضا ہے کہ مدینہ منورہ میں آیا اور پھر رخصت؟ ارے یہاں سر کو ہمیشہ کے لئے رکھنے کا موقع ہے یعنی مدینہ میں دفن ہونے کا موقع ہے۔ حضرت امام رضا کے اس شعر کو مقام فنا میں شمار کرنا ہی زیادہ مناسب ہے، اس وضاحت کے بعد شیخ بدرالدین صاحب قبلہ نے ہمدانی صاحب کو اپنی پر خلوص دعاؤں سے نوازا۔

پہلی بات تو یہ کہ امام احمد رضا کے اس شعر پر معترض کے اعتراض کو شیخ بدرالدین نے نقل کیا تھا۔ ان سے جواب نہ پڑا تو ہمدانی صاحب سے رجوع کیا لیکن پوری داستان جس پیرائے میں بیان کی گئی ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ معترض خود ہمدانی صاحب کے سامنے ہے اور منظر خالص مناظرانہ ہے۔

اس بے سر و پا سوال کا مکمل جواب تھا..... خاموشی،

جواب جاہلاں باشد خموشی

پھر یہ کہ شعر میں سر سے چلنے کا ذکر ہے اور اس کے حقیقی معنی متعذر ہیں سر سے کوئی چل ہی نہیں سکتا، پھر معترض کا یہ کہنا کہ جانوروں کی ہیئت سے چلنے کی تعلیم دی جا رہی ہے، مہمل بات ہے۔ کیا جانور سر سے چلتے ہیں؟ کیا بندر سر سے چلتا ہے؟ اس لئے اساتذہ نے جو سر سے چلنے کے معنی ادب و احترام سے چلنا بتایا ہے اسی پر اڑے رہنا چاہئے تھا۔ ''دھوپ کھانا'' دھوپ میں بیٹھنے کو کہتے ہیں اگر کوئی ضدی کہے کہ واہ دھوپ بھی کھانے کی چیز ہے؟ کھانے کی چیز سے تو پیٹ بھرتا ہے، ایسے سر پھرے سے تو منھ پھیر لینا ہی عقل مندی ہے نہ یہ کہ اس کی باتوں میں آ کر خود

اپنے صحیح قول کی تردید کرنا، یہاں تو حضرت رضا صرف تلقین کرر ہے ہیں کہ:

ارے سر کا موقع ہے او جانے والے

جس کا متعارف مفہوم معترض کی باتوں میں آ کر بدل دیا گیا اور مدینہ میں مر جانے اور دفن ہونے کا مفہوم گھڑلیا گیا، جہاں صاف صاف کہا گیا ہے۔

ہاں ہاں رہ مدینہ ہے غافل ذرا تو جاگ
او پاؤں رکھنے والے یہ جا چشم و سر کی ہے

یہاں کیا توجیہ کی جائے گی؟

اگر چہ اس کے بعد بھی لکھنے کے لئے اتنا کچھ رہ گیا ہے کہ اگر سرورق سے لے کر آخری عنوان کتاب تک کا دِقّتِ نظر سے جائزہ لیا جائے تو اس کتاب کی ضخامت کی ایک کتاب تیار ہو جائے گی مثلاً:

ٹائٹل پر ایک ترازو دکھائی گئی ہے جس کے ایک پلہ پر دیوان حدائق بخشش اور امام احمد رضا کا نام ہے اور دوسرے پلہ پر کم و بیش پچاس اساتذۂ فن اور نامور شعرا کے نام ہیں، ترازو کسی سہارے (Support) کے بغیر ہے، دوسرا پلہ اٹھا ہوا دکھایا گیا ہے یہاں یہ جتانا مقصود ہے کہ یہ سارے کے سارے شعرا مل کر بھی فن شعر و سخن میں امام احمد رضا کے برابر نہیں ہیں، اس دوسرے پلہ میں اقلیم سخن کا وہ شہر یار بھی ہے جس کی روح قبر میں خود اپنی فکر سخن پر نوحہ زن ہوگی۔

مری قدر کر اے زمین سخن
تجھے بات میں آسماں کردیا
سبک ہو چلی تھی ترازوئے شعر
مگر ہم نے پلہ گراں کردیا

میرے ذہن میں بار بار یہ سوال اٹھتا ہے کہ اگر اس دوسرے پلے پر سید کچھوچھوی یا سید مارہروی کا نام ہوتا تو ترازو کا کیا ہوتا؟ اور اگر سارے نامور شعرا کی جگہ صرف تاج الفحول کا نام ہوتا تو ترازو کیا بتاتی؟ اور اگر حدائق بخشش کے متوازی پلہ پر حضرت عینی کے نعتیہ کلام کا صرف ایک کاغذ کا ٹکڑا رکھ دیا جاتا تو ترازو کا کیا حال ہوتا؟ میرا وجدان کہہ رہا ہے کہ کانٹا ٹوٹ جاتا اور

دونوں پلے زمین پر ڈھیر ہو جاتے۔ یہ اور اس قسم کی بے تکی باتوں سے کتاب بھری پڑی ہے۔

تاہم اسی پر اکتفا کیا جاتا ہے اگر معارف رضا (پاکستان) کے اعلان نے اس کا موقع نہ دیا ہوتا اور احباب کا پیہم اصرار نہ ہوتا تو شاید جو کچھ لکھا گیا ہے اس کی نوبت نہ آتی اور صرف یک سطری تبصرہ کافی ہوتا۔

'کنزالایمان' اور 'معارف القرآن' کا تقابلی مطالعہ

اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی کے ترجمۂ قرآن ''کنز الایمان'' کے تعلق سے صدہا مضامین شائع ہو چکے ہیں ان میں سے بیشتر کا تعلق اغیار کے تراجم کے ردو ابطال سے ہے۔ یعنی کنزالایمان کی خوبیوں پر کم توجہ دی گئی ہے، اغیار کے تراجم کی غلطیوں کی نشاندہی پر زیادہ زور قلم صرف کیا گیا ہے، اس سے صحیح اور غلط کا امتیاز تو ہو گیا، لیکن کنزالایمان کا حقیقی حسن ہنوز پس پردہ رہ گیا۔ فاضل بریلوی اپنے عہد کے اعلم العلما بھی تھے اور زبان و بیان کے اعتبار سے بھی وہ جلال و امیر سے کم نہ تھے اس لیے وہ قرآنی آیات کے مفہوم و مراد کو اردو زبان میں منتقل کرنے پر دیگر مترجمین عہد سے زیادہ قدرت رکھتے تھے، افسوس کہ اس نہج پر کام نہیں ہوا بلکہ چند آیات کے ترجمے ایسے ہیں جن پر محققین کو خصوصی طور پر توجہ کرنی چاہیے تھی مثلاً آیہ کریمہ وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ کا ترجمہ ہر کسی نے یوں کیا ہے ''نہ ملاؤ حق کو باطل سے'' یعنی حق کو لاتلبسوا کا مفعول بہ قرار دیا گیا ہے۔ فارسی تراجم میں شیخ سعدیؔ اور شاہ ولی اللہ نے بھی اسی طرز پر ترجمہ کیا ہے۔ ذہن تو اسی کو قبول کرتا ہے کہ ملاوٹ اصلی میں نقلی کی ہوتی ہے لیکن سارے ترجمے حق کو باطل سے نہ ملانے کو ظاہر کر رہے ہیں یہ ایک بہترین موضوع ہے ان لوگوں کے لیے جو کنزالایمان پر تحقیقی کام کرنا چاہتے ہیں۔ اسی طرح آیہ کریمہ ''قُلْ هُوَ اللّٰهُ أَحَدٌ ﴿١﴾'' کا عام طور پر ترجمہ یوں کیا جاتا ہے ''تم کہو وہ اللہ ایک ہے'' کنزالایمان میں ترجمہ یوں کیا گیا ہے ''تم فرماؤ وہ اللہ ہے وہ ایک ہے'' یہ محض دو مثالیں ہیں، ایسا نہیں ہے کہ ترجمہ کرتے وقت فاضل بریلوی کے پیش نظر فارسی اور اردو کے تراجم نہیں تھے، بااین ہمہ سب سے منفرد ترجمہ کرنے میں کچھ خاص ضرور رہے جو زبان اور قواعد کی روشنی میں سامنے آنا چاہیے۔

عربی زبان سے فارسی اور اردو زبان میں ترجمہ کرنے والوں میں سب سے زیادہ دقت کا سامنا ان بزرگوں کو کرنا پڑا ہوگا جنہوں نے پہلے پہل یہ کام کیا ہوگا۔ شاہ عبدالقادر وہ پہلے بزرگ ہیں جنہوں نے سب سے پہلے اردو زبان میں قرآن کا بامحاورہ ترجمہ فرمایا، بقول شخصے۔

''اردو زبان اس دور میں ابتدائی منزل سے گزر رہی تھی اور اس کا دامن بھی الفاظ و تراکیب کی وسعت سے خالی تھا مگر شاہ عبدالقادر صاحب نے جو با محاورہ ترجمہ کیا ہے اسے شاہ صاحب کی مذہبی صلاحیت اور ذہانت و فطانت کا کمال ہی کہا جاسکتا ہے'' اور بقول شخصے ''شاہ صاحب نے مسجد اکبرآبادی میں چالیس برس اعتکاف کی حالت میں ترجمہ قرآن تحریر فرمایا''

اور یہ قول ڈپٹی نذیر احمد، جنہوں نے خود بھی ۱۳۱۱ھ میں ترجمہ قرآن کیا ہے ''جب ایک خاندان کے ایک چھوڑ تین تین ترجمے لوگوں کو مل گئے ایک فارسی مولانا شاہ ولی اللہ صاحب کا اور اکٹھے دو دو اردو ترجمہ ایک شاہ عبدالقادر صاحب کا اور ایک شاہ رفیع الدین صاحب کا تو اب ہر ایک کو ترجمے کا حوصلہ ہوگیا مگر خاندان ولی اللہی کے سوا کوئی شخص مترجم ہونے کا دعویٰ نہیں کرسکتا وہ ہرگز مترجم نہیں بلکہ مولانا شاہ ولی اللہ اور ان کے بیٹوں کے ترجموں کا مترجم ہے کہ انہیں ترجموں میں اس نے ردوبدل، تقدیم وتاخیر کرکے جدید ترجمہ کا نام کردیا ہے''

ڈپٹی نذیر احمد کی اس رائے سے ضروری نہیں کہ بالکلیہ اتفاق کیا جائے لیکن یہ سچ ہے کہ شاہ عبدالقادر صاحب جیسے صاحب کشف بزرگ نے ترجمہ قرآن کا جو عظیم کارنامہ انجام دیا ہے یہ بعد کی نسل کے مترجمین کے لیے مشعل راہ ثابت ہوا ہے۔

مولانا اخلاق حسین قاسمی کی ایک تحریر سے مستفاد ہے کہ شاہ صاحب کے موضح قرآن میں بعد میں کچھ لفظی و معنوی تحریف کی گئی ہے، میرے خیال میں ضرور کی گئی ہے۔ شاہ صاحب کے بعد دہلی میں مولانا اسماعیل کے پیروکاروں کا غلبہ رہا۔ مولانا مملوک علی اور مولانا خرم علی وغیرہ سے جو سلسلہ چلا وہ شاہ عبدالعزیز اور شاہ عبدالقادر کے معتقدات سے ہٹ چکا تھا۔ موضح قرآن کی اشاعت اسی سلسلہ کے لوگوں کے ہاتھوں عمل میں آئی، نتیجہ ظاہر ہے اگر یہ نہ ہوتا تو شاید اعلیٰ حضرت کو الگ سے ترجمہ قرآن کی ضرورت کی طرف متوجہ کرنے کی ضرورت واقع نہ ہوتی۔

کنزالایمان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ:

> ''امام احمد رضا زبانی طور پر آیات کریمہ کا ترجمہ بولتے جاتے اور صدرالشریعہ اس کو لکھتے رہتے لیکن یہ ترجمہ اس طرح پر نہیں تھا کہ آپ پہلے کتب تفسیر ولغت ملاحظہ فرماتے بعدۂ آیت کے معنی سوچتے پھر ترجمہ

بیان کرتے بلکہ آپ قرآن مجید کافی البدیہہ برجستہ ترجمہ زبانی طور پراسی
طرح بولتے جاتے جیسے کوئی پختہ یادداشت کا حافظ اپنی قوت حافظہ پر
بغیرزورڈالےقرآن شریف روانی سے پڑھتا جاتا ہے''۔

(المیزان امام احمد رضانمبر)

اس عبارت سے ظاہر ہے کہ اعلیٰ حضرت نے ترجمہ کا کام کسی کتاب کی مدد کے بغیر کیا اور ایسا علمی استحضار تھا کہ انہیں کسی کتاب کی مدد کی ضرورت بھی نہیں تھی، بعد کے قلم کاروں نے تو اسے اور بھی چٹ پٹا بنا کر پیش کیا ہے، لیکن ''تذکرہ اعلیٰ حضرت بزبان صدر شریعت'' کچھ اور ہی کہتا ہے، یہ تذکرہ ۲۰۰۳ء میں دوسری بار تحریک فکر رضا ممبئی نے شائع کیا ہے، جو علامہ عبدالحکیم شرف قادری کی تقریظ سے مزین ہے، اس کتاب میں ''اعلیٰ حضرت سے ترجمہ کی درخواست'' کا ایک عنوان قائم کیا گیا ہے، اس میں صدرالشریعہ نے ترجمہ قرآن کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے اعلیٰ حضرت سے اس کی گزارش کی ہے، اس کا جو جواب اعلیٰ حضرت نے دیا ہے اس کا علاحدہ عنوان ''اشاعت ترجمہ کی مشکلات'' قائم کیا گیا ہے-اس کے بعد ''ترجمہ قرآن پاک کا اہتمام'' کے عنوان کے تحت جو مذکور ہے اس کا کچھ حصہ یہاں نقل کیا جاتا ہے:

(اعلیٰ حضرت نے-شرر) فرمایا کہ:

''دوسرے لوگوں کے تراجم بھی حاصل کرلیے جائیں تاکہ اس ضمن میں ان کے اغلاط پر تنبیہات بھی کردی جائیں یہ بھی ایک ضروری کام ہے، (دوسروں کے ترجمہ والا) قرآن پاک ڈاک وغیرہ سے نہ منگایا جائے کہ اس میں بے ادبی ہوتی ہے بلکہ اس کے لیے جہاں سے دستیاب ہوتے ہوں، جاکر ایسے طریقے پر لائے جائیں کہ بے ادبی نہ ہو ، میری عدیم الفرصتی اور کام کی کثرت نے مہینوں تک تراجم کے حاصل کرنے کا موقع نہ دیا خیر کسی نہ کسی طرح انہیں شرائط کے مطابق اس زمانے میں جتنے ترجمے شائع ہوچکے تھے سب حاصل کرلیے گئے اور ترجمے کا کام بفضلہٖ تعالیٰ شروع ہوا- چند روز یہ طریقہ رہا کہ آیت

پڑھی جاتی اور اعلیٰ حضرت اس کا ترجمہ لکھواتے اس کے بعد شیخ سعدی علیہ الرحمہ، شاہ ولی اللہ صاحب، شاہ عبدالقادر صاحب، شاہ رفیع الدین صاحب، ڈپٹی نذیر احمد، مرزا حیرت دہلوی، اور مولوی اشرف علی تھانوی وغیرہم کے ترجمے سنائے جاتے اور ان تراجم میں جہاں کہیں غلطیاں ہوتیں ان پر تنبیہ فرماتے۔''

(چند سطروں کے بعد-شرر)

''**حضرت شیخ سعدی علیہ الرحمہ کا ترجمہ فارسی میں اور شاہ عبدالقادر صاحب کا اردو میں یہ دو ترجمے سنائے جاتے اور اس کا سلسلہ اخیر تک جاری رہا،** حضرت شیخ سعدی علیہ الرحمہ کا ترجمہ نہایت پاک وصاف ہے سوا اس کے کہ وہ مذہبا شافعی ہیں، آیات کا مطلب شافعیہ کچھ اور لیتے ہیں اور حنفیہ کچھ اور، وہاں تو ان کا ترجمہ ہمارے مذہب کے خلاف ضرور تھا ورنہ کہیں بھی بہ ظاہر کوئی سقم نظر نہیں آیا، شاہ عبد القادر کا ترجمہ بھی تقریباً صحیح ہے مگر بعض جگہ ان کے ترجموں میں بھی خرابی نظر آئی۔''(ص:۴۳)

کیا ان عبارات سے ظاہر نہیں ہے کہ ترجمہ کے دوران شیخ سعدی کا ترجمہ فارسی اور شاہ عبدالقادر کا ترجمۂ اردو بالالتزام پڑھ کر سنایا جاتا تھا؟ اور کیا اس سے مستفاد نہیں ہے کہ اعلیٰ حضرت نے ان دو تراجم سے بھرپور استفادہ کیا؟

جب شیخ سعدی علیہ الرحمہ کا ترجمہ فارسی بالکل صحیح تھا اور شاہ صاحب کا ترجمہ اردو بھی تقریباً صحیح تھا اور دونوں ترجمے سنائے جاتے تھے پھر ایک ماہر علم وفن کو ترجمہ کرتے وقت مزید غور وفکر کی ضرورت ہی کیا باقی رہ جاتی ہے۔ شیخ سعدی علیہ الرحمہ کا ترجمہ اِس وقت میرے پیش نظر ہے اور فتاوی رضویہ کی وہ عبارت بھی جس میں اعلیٰ حضرت نے ترجمہ شیخ سعدی کے بالکل صحیح ہونے کا سرٹیفکٹ دیا ہے (بحوالہ فتاوی رضویہ، جلد دہم، نصف آخر، ص:۱۲۷) اس لیے کنزالایمان کے تعلق سے بعد کے قلم کاروں نے جو کچھ لکھا ہے وہ کچھ زیادہ ہی میٹھا ہوگیا

ہے ہمیں اپنے بزرگوں کے احسانات فراموش نہیں کرنے چاہئیں- جہاں تک میں نے غور کیا ہے، میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اعلیٰ حضرت نے ترجمہ میں صیغوں کا استعمال نہایت غور وفکر کے ساتھ کیا ہے اور بیان مراتب کے لیے ذہن میں ایک خاکہ مرتب کیا جو کنزالایمان میں ملاحظہ کیا جاسکتا ہے- مثلاً ''قل'' کا ترجمہ اس آیہ شریفہ کے تحت ''عرض کرو'' کیا ہے-وقل رب اغفر وارحم وانت خیر الرحمین اورتم عرض کرواے میرے رب بخش دے اور رحم فرمااور تو سب سے برتر رحم کرنے والا ہے، یہاں اللہ تعالیٰ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اپنے لیے فرمایا ہے-اس لیے یہاں قل کا ترجمہ عرض کرو نہایت مناسب ہے اور جہاں اللہ تعالیٰ نے حکم فرمایا ہے کہ دوسروں سے کہو وہاں قل کا ترجمہ ''تم فرماؤ یا تم فرمادو'' کیا گیا ہے- یہاں اس امر کی رعایت ملحوظ ہے کہ لفظ ''تم'' سے خطاب، خدا کا رسول کے لیے ہے اور ''فرماؤ یا فرمادو'' سے رسول کا برائے دیگراں ہے، مثلاً:

قُلْ اَغَيْرَ اللّٰهِ اَتَّخِذُ وَلِيًّا

تم فرماؤ کیا اللہ کے سوا کسی اور کو والی بناؤں؟

قُلْ اِنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ

تم فرماؤ کہ وہ تو ایک ہی معبود ہے

قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَخَذَ اللّٰهُ سَمْعَكُمْ وَاَبْصَارَكُمْ

تم فرماؤ بھلا بتاؤ تو اگر اللہ تمہارے کان آنکھ لے لے

اور جہاں اللہ تعالیٰ کا کلام دیگر انبیاء ورسل علیہم الصلوٰۃ والسلام کے لیے ہے وہاں بالالتزام صیغہ واحد استعمال کیا گیا ہے، اس کی چند مثالیں پیش ہیں:

وَنَجَّيْنٰهُ وَلُوْطًا

اور ہم نے اسے اور لوط کو نجات بخشی

وَلِسُلَيْمٰنَ الرِّيْحَ عَاصِفَةً الاية

اور سلیمان کے لیے تیز ہوا مسخر کردی کہ اس کے حکم سے چلے

وَذَا النُّوْنِ اِذْ ذَّهَبَ مُغَاضِبًا الاية

اورذوالنون کو جب چلا غصے میں بھرا

وَلَقَدۡ اٰتَيۡنَاۤ اِبۡرٰهِيۡمَ رُشۡدَهٗ الاية

اور بے شک ہم نے ابراہیم کو پہلے ہی سے اس کی نیک راہ عطا کردی۔

فَاَوۡحَيۡنَاۤ اِلٰى مُوۡسٰٓى اَنِ اضۡرِبْ بِّعَصَاكَ الۡبَحۡرَ ؕ

تو ہم نے موسیٰ کو وحی فرمائی کہ دریا پر اپنا عصا مار

میں نے کنزالایمان کا بالاستیعاب یعنی از اول تا آخر مطالعہ نہیں کیا ہے، لیکن جہاں تک نظر گئی ہے اس کی روشنی میں یہ عرض کیا گیا ہے۔ ان تراجم سے ظاہر ہے کہ صیغوں کا استعمال نہایت غور وفکر کے ساتھ کیا گیا ہے، برجستہ اور فی الفور جیسے الفاظ سے جو لوگ کنزالایمان کی خوبیاں بیان کرتے ہیں انہیں فاضل بریلوی کی دیگر کتب کا مطالعہ کرنا چاہیے، احکام ومسائل کی کتب میں جہاں آیات قرآنیہ کا ترجمہ کیا گیا ہے وہاں ضرور یہ بات صادق آتی ہے، کنزالایمان میں رسول اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے جہاں تک میری نظر گئی ہے کہیں بھی نہ تو قل کا ترجمہ ''تو'' کیا گیا ہے نہ ''آپ''، لیکن دیگر کتب میں ''تو''، ''آپ'' دونوں ملتے ہیں۔ مثلاً:

قُلۡ آٰللّٰهُ اَذِنَ لَكُمۡ اَمۡ عَلَى اللّٰهِ تَفۡتَرُوۡنَ ﴿۵۹﴾

''اے نبی تو ان لوگوں سے فرما اللہ نے تمہیں اس کی پروانگی دی ہے یا خدا پر بہتان باندھتے ہو''۔ (فتاویٰ رضویہ، ۱۷، ص: ۳۳۰ برکات رضا پور بندر، گجرات)

کنزالایمان میں ترجمہ یوں ہے۔ تم فرماؤ کیا اللہ نے اس کی تمہیں اجازت دی یا اللہ پر جھوٹ باندھتے ہو۔

يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ حَسۡبُكَ اللّٰهُ

اے نبی تجھ کو اللہ کافی ہے (الملفوظ، ج ۳، ص: ۵۲)

کنزالایمان میں ترجمہ یوں ہے اے غیب کی خبریں بتانے والے (نبی) اللہ تمہیں کافی ہے۔

يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الۡكُفَّارَ وَالۡمُنٰفِقِيۡنَ

اے نبی جہاد کر کافروں اور منافقوں سے

(الملفوظ، ج ۱، ص: ۴۱)

کنزالایمان میں ترجمہ یوں ہے:

اے غیب کی خبریں دینے والے (نبی) جہاد فرماؤ کافروں اور منافقوں پر۔

لَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ يُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ

نہ پائیں گے آپ ان لوگوں کو جو اللہ و رسول اور یوم آخر پر ایمان رکھتے ہیں کہ وہ اللہ و رسول کے مخالفوں سے دوستی رکھیں۔

(الملفوظ، ۳، ص:۶۱)

کنزالایمان میں ترجمہ یوں ہے۔

''تم نہ پاؤ گے ان لوگوں کو جو یقین رکھتے ہیں اللہ اور پچھلے دن پر کہ دوستی کریں ان سے جنہوں نے اللہ اور اس کے رسول سے مخالفت کی''۔

عبارات مذکورہ سے واضح ہے کہ کنزالایمان میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ہر جگہ قل کا ترجمہ لفظ ''تم'' سے کیا گیا ہے اور ہر جگہ صیغۂ جمع سے منصب رسالت ظاہر کیا گیا ہے تاہم قل کے تینوں ترجمے صحیح ہیں، ان پر کسی کو معترض نہیں ہونا چاہیے۔

برسوں پہلے کی بات ہے مولانا اخلاق حسین قاسمی نے کنزالایمان کے چند ترجموں پر اعتراض وارد کیا تھا راقم الحروف نے اس کا حسب توفیق جواب دیا تھا جو متعدد رسائل میں شائع ہو چکا ہے۔ ایک اور مضمون کنزالایمان اور معارف القرآن کے تقابلی مطالعہ کے تعلق سے بھی تھا اس پر بھی اظہار خیال کیا گیا تھا جو ماہنامہ قاری وغیرہ میں چھپ چکا ہے، اس میں شک نہیں کہ کنزالایمان جیسا ایمان افروز ترجمہ پیش کر کے اعلیٰ حضرت نے امت مسلمہ پر احسان عظیم فرمایا۔ ہے آج تقریباً ہر سنی گھر میں یہ موجود ہے اور قارئین اس سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کرتے ہیں۔

البتہ میں نے یہ ضرور کہا تھا کہ اردو ایک ارتقا پذیر زبان ہے بہت سے الفاظ جو قدیم زمانے میں رائج تھے ان کا چلن اب نہیں رہا اور سیکڑوں نئے الفاظ سے اردو مالا مال ہو رہی ہے۔ اس لیے کسی ترجمہ و تصنیف کے بارے میں یہ کہنا کہ الفاظ و عبارات کے لحاظ سے یہ حرف آخر ہے، اسے قبول نہیں کیا جا سکتا۔ یہ بات اس دعویٰ کے تناظر میں کہی گئی ہے جو کنزالایمان کے بارے میں کیا گیا تھا، مجھے افسوس ہے کہ فاضل بریلوی سے اظہار عقیدت کرنے والے بعض اہل

قلم نے کہیں کہیں ایسا غلو کیا ہے کہ اب اس کا نقصان علمی حلقوں میں دیکھا جا رہا ہے جام نور کے اسی شمارہ مارچ ۲۰۱۱ء میں مولانا غلام رسول سعیدی کی یہ منقولہ عبارت نظر سے گزری کہ:

''اگر قرآن مجید اردو زبان میں اترا ہوتا تو یہ عبارت اس کے قریب تر ہوتی'' (ص: ۶۲)

زیر نظر ترجمہ کنز الایمان یقیناً اردو زبان و ادب کا گنج شائگاں ہے لیکن اس کی ادبی و لسانی حیثیت کو اجاگر کرنے کے لیے جس استعداد کی ضرورت ہے وہ ہمارے یہاں ناپید سی ہے، کنز الایمان پر تحقیق کرنے والوں کے پورے سرمائے کا ۹۹ فیصد اغیار کے تراجم کی اغلاط کی نشاندہی پر مشتمل ہے فاضل بریلوی سے علمی استفادہ کرنے والے اگر چاہتے تو ان الفاظ کو رائج کرتے جو اعلیٰ حضرت نے استعمال کئے ہیں جن کی نظیر سابق میں نہیں ملتی جو سبک بھی ہیں اور کانوں کو بھلے بھی معلوم ہوتے ہیں جیسے کافر عورتوں کی جگہ ''کافرنیوں'' جوان عورتیں'' کی جگہ ''جوانیں'' اور روزہ دار عورتیں کی جگہ ''روزہ داریں'' وغیرہ اگر ہمارے علما اور خواندہ حضرات ان الفاظ کو تسلسل کے ساتھ استعمال کرتے تو آج یہ ہماری زبان کا حصہ بن کر سکۂ رائج الوقت ہوتے۔

حضور محدث اعظم ہند علیہ الرحمہ نے ناگ پور میں ۱۳۷۹ھ کے جشن ولادت امام احمد رضا کے موقع پر اپنے تحریری خطبۂ صدارت میں کنز الایمان کے تعلق سے لکھا تھا:

''علم قرآن کا اندازہ اگر صرف اعلیٰ حضرت کے اس ترجمے سے کیجیے جو اکثر گھروں میں موجود ہے اور جس کی کوئی مثال سابق نہ عربی زبان میں ہے نہ فارسی میں ہے اور نہ اردو میں اور جس کا ایک ایک لفظ اپنے مقام پر ایسا ہے کہ دوسرا لفظ اس جگہ لایا ہی نہیں جا سکتا الخ

(المیزان، امام احمد رضا نمبر، ص: ۲۴۵)

محدث اعظم ہند علیہ الرحمہ کے اس قول کو اتنی شہرت ہوئی کہ ہند و پاک کے بیشتر اہل قلم جنھوں نے کنز الایمان پر خامہ فرسائی کی ہے اس قول کو زینت قرطاس بنایا ہے، مجھے حیرت ہے کہ گنتی کی یہ چند سطریں تو انہیں یاد رہیں اور ۲۴۷ صفحات پر مشتمل ''معارف القرآن'' نظروں

سے اوجھل رہا۔ بالکل سامنے کا سوال ہے کہ اگر یہ صحیح ہے کہ اس کا ایک ایک لفظ اپنے مقام پر ایسا ہے کہ دوسرا لفظ اس جگہ لایا ہی نہیں جا سکتا تو پھر محدث اعظم نے معارف القرآن کے نام سے ایک علاحدہ ترجمۂ قرآن کی ضرورت کیوں محسوس کی؟ اس کے جواب میں اس کے سوا کیا کہا جا سکتا ہے کہ محدث اعظم کی مراد یہ ہے کہ کنزالایمان اپنے معانی و مفاہیم کے اعتبار سے ایسا جامع اور معتبر تفاسیر سے غذا یافتہ ترجمہ ہے کہ اگر مستعملہ الفاظ کی جگہ ایسے الفاظ لائے جائیں جن سے معانی و مفاہیم تبدیل ہو جائیں تو یہ قرآن کی حقیقی مراد کے خلاف ہوگا۔

اس میں کسی فرد کا اختلاف نہیں ہے کہ قرآن مجید کا ترجمہ کرتے وقت حضور محدث اعظم ہند علیہ الرحمہ کے پیش نظر کنزالایمان تھا شیخ الاسلام حضرت علامہ سید محمد مدنی میاں مدظلہ کو بھی اس کا اعتراف ہے اس لیے جن لوگوں نے معارف القرآن پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ حضور محدث اعظم ہند نے اپنے ترجمے میں کنزالایمان کی خوبیوں کو سمیٹ لیا ہے اور رائج الفاظ سے ترجمے کو عوام و خواص تک رسا بنا دیا ہے اس سے اختلاف نہیں کیا جا سکتا۔

کنزالایمان کے بہت سے الفاظ کی وضاحت ترجمہ کے ساتھ قوسین میں کی گئی ہے اور کچھ الفاظ کی وضاحت مولانا عبدالمبین نعمانی نے اپنے نسخۂ مصححہ کنزالایمان کے فٹ نوٹ میں فرمائی ہے، اس سے ظاہر ہے کہ ان کی نظروں میں وہ الفاظ یا تو متروک تھے یا غیر معروف تھے یا علاقائی تھے جو سب کے لیے نافع نہیں تھے، محدث اعظم ہند نے اپنے ترجمے میں وہ الفاظ استعمال کیے ہیں جو اب بھی رائج اور فصیح ہیں مثلاً:

وَفِیٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا

اور ان کے کانوں میں ٹینٹ (کنزالایمان)

اور ان کے کانوں میں ڈاٹ (معارف القرآن)

كَمَثَلِ جَنَّةٍۭ بِرَبْوَةٍ اَصَابَهَا

اس باغ کی سی ہے جو بھوڑ پر ہو (کنزالایمان)

جیسے باغ ہو ٹیلے پر (معارف القرآن)

وَخَسَفَ الْقَمَرُ ﴿٨﴾

اور چاند گہے گا (کنزالایمان)

اور گہن میں پڑا چاند (معارف القرآن)

یہ محض چند مثالیں ہیں جن میں کنزالایمان کا کوئی لفظ غلط نہیں ہے لیکن معارف القرآن نے رائج الوقت الفاظ استعمال کر کے عوام وخواص کے لیے قابل فہم بنا دیا۔

اسی قبیل کا ایک لفظ ''کڑوڑا'' ہے جو اردو کے سابق تراجم کے داروغہ کی جگہ اعلیٰ حضرت نے استعمال کیا ہے، لیکن محدث اعظم نے کڑوڑا کا استعمال نہیں کیا ہے بلکہ آیہ مبارکہ لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ ﴿۲۲﴾ کا ترجمہ جواب دہ داروغہ کیا ہے۔ یہاں مجھے کڑوڑا سے کوئی سروکار نہیں ہے، معترض بھی نہیں ہوں، لغت کی کتابوں میں اس کا ذکر ہے، لیکن جن لوگوں نے اغیار کے ترجمہ میں وکیل یا مُصَيْطِرٍ کا ترجمہ داروغہ دیکھ کر بکواس کی ہے ان کو اس کثیر الجہات اور کثیر المعانی لفظ کے بارے میں کچھ اتا پتا نہیں ہے، یہ لوگ داروغہ کو محض پولیس محکمہ کا ایک عہدہ سمجھتے ہیں جس کے اوپر ایس پی ہوتا ہے، اس کے اوپر ڈی آئی جی وغیرہ۔

اس لیے میں یہاں اس کی قدرے وضاحت کیے دیتا ہوں تا کہ شاہ عبدالقادر شاہ رفیع الدین اور حضور محدث اعظم ہند کے ترجموں میں اس لفظ کے برمحل استعمال کا اندازہ ہوسکے۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ داروغہ زمانۂ قدیم میں سرکاری عہدہ سے مختص نہیں تھا، مملکت کے رؤسا کے یہاں بھی داروغہ رکھے جاتے تھے جو امور مفوضہ کے نگراں اور ذمہ دار ہوتے تھے اور اپنے فرائض کے تئیں جواب دہ بھی۔ میر انیس کے نواسے پیارے صاحب رشید کے تذکرہ میں ہے:

> ''چوں کہ میر صاحب قبلہ ملکہ جہاں (میرِ صاحب کی اہلیہ) کے ہمراہ جانا چاہتے تھے لہذا یہاں کے انتظام وانصرام کے لیے ایک اور داروغہ کی ضرورت محسوس ہوئی اس کے لیے میر صاحب کے صاحبزادے جناب صابر صاحب تجویز ہوئے''۔

(ص:۱۲۸، صبح المطابع تھوئی ٹولہ لکھنو)

اس کے علاوہ لغت نامہ دہخدا میں ہے:

''داروغہ (غ) رئیس شب گرداں سرپاسباناں داروغہ کہ درزمان

مغولی به معنی رئیس است یک اصطلاح عمومی اداری است از احسن التواریخ چنیں مستفاد می گردد که داروغہ بہ طور کلی بہ حکام اطلاق می شده بعدہالقب حاکم پائے تخت گردیده''۔(ج-ص: ۶۲۳ ازعلی اکبر دہخدا)

''داروغہ(تر-مغ) داروغا نگہبان خانہ یا ادارہ، محافظ قریہ یا شہر بزرگ تر ہر صنف ودستہ سرودستہ نگہباناں، کلاں تر''۔(فرہنگ فارسی، دکتور معین)

جیسا کہ مذکور ہوا کنزالایمان میں حضور خاتم الانبیا صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا دیگر انبیا ورسل علیہم الصلوٰۃ والسلام کے لیے صیغہ واحد کا استعمال کیا گیا ہے، معارف القرآن میں ایسا نہیں ہے بلکہ صیغے وہی استعمال کیے گیے ہیں جو نفس رسالت ونبوت کے اعتبار سے صاحب معارف القرآن نے مناسب خیال فرمایا، مثلاً:

وَنَجَّيْنٰهُ وَلُوْطًا الآیه

اور بچالے گیے ہم انہیں اور لوط کو

وَلِسُلَيْمٰنَ الرِّيْحَ عَاصِفَةً الآیه

اور سلیمان کے لیے تیز ہوا کو کہ چلا کرے ان کے حکم سے

وَذَا النُّوْنِ اِذْ ذَّهَبَ الآیه

اور ذوالنون کو جب کہ چل پڑے تھے غصے میں بھرے۔ وغیر ذلک

بندۂ راقم کی نظر میں ان میں سے کوئی ترجمہ غلط نہیں ہے ہاں زیادہ اچھا کون سا ترجمہ ہے اس کا فیصلہ قارئین خود فرمائیں۔

کنزالایمان میں جہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر ہے اور وہ اپنے کافر باپ سے مخاطب ہیں وہاں بھی دونوں تراجم میں انداز بیان کا بین فرق ہے، اعلیٰ حضرت کی نظر اس پر تھی کہ آزر کافر تھا اس کے ساتھ رورعایت چہ معنی؟ اور محدث اعظم کی نظر اس پر تھی کہ آزر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے باپ تھے اس لیے امور دنیاوی میں صلہ رحمی کے کچھ تو تقاضے ہیں۔ دونوں ترجمے ملاحظہ ہوں:

اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ يٰۤاَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا يَسْمَعُ وَلَا يُبْصِرُ وَلَا يُغْنِيْ عَنْكَ شَيْـًٔا﴿۴۲﴾ يٰۤاَبَتِ اِنِّيْ قَدْ جَآءَنِيْ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَمْ يَاْتِكَ فَاتَّبِعْنِيْۤ اَهْدِكَ صِرَاطًا سَوِيًّا﴿۴۳﴾ يٰۤاَبَتِ لَا تَعْبُدِ الشَّيْطٰنَ ؕ اِنَّ الشَّيْطٰنَ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ عَصِيًّا﴿۴۴﴾ يٰۤاَبَتِ اِنِّيْۤ اَخَافُ اَنْ يَّمَسَّكَ عَذَابٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ فَتَكُوْنَ لِلشَّيْطٰنِ وَلِيًّا﴿۴۵﴾

ترجمۂ اعلیٰ حضرت:

''جب اپنے باپ سے بولا اے میرے باپ کیوں ایسے کو پوجتا ہے جو نہ سنے نہ دیکھے اور نہ کچھ تیرے کام آئے، اے مرے باپ بے شک میرے پاس وہ علم آیا جو تجھے نہ آیا تو تو میرے پیچھے چلا آ میں تجھے سیدھی راہ دکھاؤں - اے میرے باپ شیطان کا بندہ نہ بن بے شک شیطان رحمن کا نافرمان ہے اے میرے باپ میں ڈرتا ہوں کہ تجھے رحمن کا کوئی عذاب نہ پہنچے تو تو شیطان کا رفیق ہو جائے''۔ (ص:۵۵۴)

ترجمۂ محدث اعظم!

''جب کہ کہا اپنے بابا کو'' کہ اے بابا کیوں پوجتے ہو جو نہ سنے اور نہ دیکھے اور نہ کام آئے تمہارے کچھ اے بابا بلاشبہ آ گیا ہے میرے پاس علم کا وہ حصہ جو نہ آیا تم تک، تو میرے پیچھے لگے رہو میں لے چلوں گا تم کو سیدھی راہ اے بابا شیطان کو نہ پوجو کہ شیطان تو رحمٰن کا نافرمان ہی رہا اے بابا میں ڈرتا ہوں کہ لگ جائے تمہیں عذاب اللہ مہربان کا تو ہو جاؤ تم شیطان کے دوست''۔

ترجمے دونوں صاف اور بے غبار ہیں صرف زاویہ نگاہ کا فرق ہے۔ اعلیٰ حضرت کی غیرت کا جو تقاضا تھا انہوں نے اس کو پورا کیا اور محدث اعظم نے صلہ رحمی کے تقاضے کا لحاظ رکھا۔ بخاری و مسلم کے حوالے سے شیخ ابو عبدالرحمن عبدالحلیم محمد ابو شقہ لکھتے ہیں:

''حضرت اسما بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میری ماں جو کہ مشرک تھیں نبی کریم ﷺ کے زمانے میں میرے پاس آئیں، میں نے نبی کریم ﷺ سے پوچھا کہ میری ماں میرے پاس آئی ہیں اور وہ مجھ سے ملنا چاہتی ہیں، کیا میں ان کے ساتھ صلہ رحمی کا معاملہ کروں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہاں اپنی ماں کے ساتھ صلہ رحمی کا معاملہ کرو'' بحوالہ خواتین کی آزادی عہد رسالت میں''۔ (ص ۱۱۶)

معارف القرآن کے بارے میں پروفیسر مسعود احمد دہلوی کا تبصرہ نہایت جامع ہے، جس کی تائید کی جانی چاہیے کہ ''فاضل مترجم علیہ الرحمہ امام احمد رضا علیہ الرحمہ کے محبوب شاگرد تھے، صحبت سے سرفراز ہوئے تھے علمی فیض پایا تھا وہی فیض اس ترجمے میں قدم قدم پر جھلک رہا ہے پھر فاضل مترجم کے اجداد کے فیض و کرم نے اور خود مترجم کی ذہانت و فطانت اور بصیرت نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا۔

پروفیسر ڈاکٹر مسعود احمد مجددی

باایں ہمہ درد دل جانان خودت خوانم

پہلی قسط

(شمارہ اکتوبر ۲۰۱۰ء)

مفتی اعظم شاہ مظہر اللہ نقشبندی مجددی کے فرزند ارجمند پروفیسر مسعود احمد ماہر رضویات کی حیثیت سے متعارف ہیں- اعلیٰ حضرت کے فکروفن پر ریسرچ کرنے والوں کے وہ بہترین صلاح کار تھے-فکر رضا پر تحقیق کے لیے نئی نئی جہتیں تلاش کرنا ان کا محبوب مشغلہ تھا- یہی اختصاص و امتیاز کچھ کم نہ تھا کہ شاہی مسجد فتحپوری کے امام و خطیب مفتی مکرم احمد صاحب نے ''**مجدد ماۃ حاضرہ**'' لکھ کر ایک نئی جہت سے پروفیسر صاحب کا تعارف پیش کر دیا، چوں کہ مجدد فرمان نبوی علیہ التحیۃ والثنا کے مطابق صد سالہ دورانیہ میں دین کا مصلح ہوتا ہے-شریعت کو افراط وتفریط سے پاک وصاف کرنے کا فریضہ انجام دیتا ہے جیسے شیخ احمد سرہندی اور مولانا احمد رضا خان فاضل بریلوی نے اپنے اپنے دور میں تجدیدی کارنامے انجام دیے، اس لیے پروفیسر صاحب کے حق میں ''مجدد'' کی آواز سے تھوڑی دیر کے لیے ہمارے نبضات فکر و احساس میں ارتعاش ضرور پیدا ہوگیا تھا پھر ہم نے دل ہی دل میں ایک اور مجدد فرض کر کے تعدیل مزاج کر لی اور نبض طبعی عود کر آئی-

پروفیسر مسعود احمد سے مجھے دہلی میں دو بار ملاقات کا اعزاز حاصل ہوا، پہلی بار رضوی کتاب گھر واقع مٹیا محل دہلی کے آفس میں، اس وقت کتب خانہ کے مالک اور کنزالایمان کے ایڈیٹر حافظ قمر الدین صاحب کے علاوہ مولانا یٰسین اختر مصباحی بھی موجود تھے- پروفیسر صاحب نے رضویات پر تحقیق و ریسرچ کرنے والوں کے بارے میں معلومات بہم پہچائیں، جہاں جہاں جس جس نہج پر تحقیقی کام ہو رہا ہے ان کی تفصیلات بتائیں- میں نے موقع کو غنیمت جان کر ان سے کہا کہ

یہ جو ''فوزِ مبین در رد حرکت زمین'' فاضل بریلوی کے وصال کے تقریباً ستر سال کے بعد منظرِ عام پر لائی گئی ہے اس کو عصری علوم کے کسی اکسپرٹ کے بیش قیمت مقدمہ کے ساتھ شائع کیا جانا چاہیے تھا کیوں کہ سائنس کے طلبہ کو ابتدائے اسباق ہی میں یہ بتا دیا جاتا ہے کہ زمین حرکت کرتی ہے پھر جیسے جیسے طلبہ اونچی کلاسوں میں جاتے ہیں یہ سائنسی نظریہ دلائل و شواہد کے ساتھ ان کے اذہان میں راسخ ہو جاتا ہے، یہی نہیں بلکہ دہلی سمیت ہندوستان کی کئی ریاستوں میں تارا منڈل بنایا گیا ہے جس میں نظامِ شمسی کا بڑے دل نشیں انداز میں مشاہدہ کرایا جاتا ہے- ایک طرف یہ مشاہدہ اذہان کو حرکت زمین کا یقین دلاتا ہے دوسری طرف فوز مبین اس کو باطل قرار دیتی ہے، دلائل عقلیہ سے بھی دلائل نقلیہ سے بھی- ظاہر ہے جو دلائل نقلیہ سے ثابت ہے اصلاً وہی ثابت ہے پھر ہم اپنا دعویٰ سائنس دانوں کے سامنے کیوں نہیں رکھتے جب کہ ہمارے پاس حرکت زمین کو رد کرنے اور سکون زمین کو ثابت کرنے کی ایک سو سے زائد دلیلیں موجود ہیں؟ پروفیسر صاحب نے فرمایا کہ آپ کی بات معقول ہے ہم نے پاکستان میں کئی سائنس دانوں سے رابطہ کیا، اگرچہ کسی کا ہمیں تحریری جواب نہیں ملا لیکن بعض ذرائع سے ہمیں معلوم ہوا ہے کہ چند سائنس داں حرکت زمین کے رد میں اعلیٰ حضرت کے دلائل دیکھ کر عش عش کر اٹھے اور وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ ایسے دلائل قاہرہ کے ہوتے ہوئے حرکت زمین کا نظریہ کیوں کر صحیح ہو سکتا ہے-

دوسری ملاقات شاہی مسجد فتحپوری کے امام و خطیب اور پروفیسر صاحب کے بھتیجے مولانا مکرم صاحب کے حجرے میں ہوئی- موصوف سے پہلی ملاقات کی یاد دلاتے ہوئے میں نے پوچھا کہ فوز مبین کے سلسلے میں پاکستان میں کیا پیش رفت ہوئی اور اس کی حقانیت کا اجالا کہاں تک پھیلا؟ جواب ملا کوئی خاص پیش رفت نہیں ہوئی اتنا ضرور ہوا کہ ہم نے پاکستان کے معروف سائنس داں جناب عبد القدیر صاحب کو خط لکھا ہے اور رد حرکت زمین کے جو دلائل فوز مبین میں ہیں ان کا خلاصہ بھی بھیج دیا ہے- ان کی طرف سے بھی کوئی جواب موصول نہیں ہوا، لیکن سنا ہے کہ اس خط اور اعلیٰ حضرت کے دلائل کو دیکھ کر وہ اعلیٰ حضرت سے بہت متاثر ہیں- میں نے پروفیسر صاحب سے کہا کہ اس موضوع پر باقاعدہ پروجیکٹ بنا کر ریسرچ کرنے کی ضرورت ہے کسی ایک دو سائنس داں کا عندیہ کافی نہیں ہوگا- لیکن میں نے محسوس کیا کہ پروفیسر صاحب اس موضوع پر

گفتگو کرنے میں ازخود دلچسپی نہیں لے رہے ہیں-

۱۹۹۲ء میں جشن حضور مفتی اعظم ہند ممبئی کے موقع پر رضا اکیڈمی نے مجھے بھی مدعو کیا تھا- بمبئی شہر کے قریب ایک ہوٹل میں بیشتر مدعوئین ٹھہرائے گئے تھے- اجلاس کے دوسرے دن اس ہوٹل میں میری ملاقات مولانا محمد ابراہیم خوشتر صدیقی اور مولانا قمر الزماں اعظمی سے ہوئی- قریب عصر ہماری اس ہوٹل میں ایک نشست ہوئی، دلچسپی کے مختلف امور پر گفتگو ہوتی رہی، میں نے مولانا خوشتر صدیقی صاحب کو مخاطب کرتے ہوئے فوزمبین کا ذکر چھیڑ دیا اور اس سلسلہ میں جماعتی بے حسی کا اظہار کرتے ہوئے یہ تجویز رکھی کہ پہلے فوزمبین کی اصطلاحات کا انگریزی متبادل تلاش کیا جائے، نہ ملے تو وضع کی جائیں اور اس کی مکمل وضاحت انگریزی زبان میں کی جائے تاکہ فوزمبین کی عبارتوں کا مفہوم سمجھنے میں کوئی دشواری پیش نہ آئے- اس کے بعد پوری کتاب کا انگریزی ترجمہ دنیا بھر کے معروف سائنس دانوں تک پہنچایا جائے، مولانا خوشتر صدیقی صاحب نے میری حوصلہ افزائی کی اور میری تجویز سے اتفاق کیا، مولانا قمر الزماں اعظمی صاحب نے مجھے مخاطب کرکے کہا کہ یہ کام آپ ہی کر سکتے ہیں، میں نے کہا مولانا! وسائل آپ کے پاس، افراد آپ کے پاس، غریب شرر مصباحی کس شمار میں، یہاں بھی بات صرف بات کی حد تک رہ گئی-

پھر کچھ دنوں بعد میں نے جماعت کے ایک بڑے مفتی صاحب سے کہا کہ حضرت کب تک ہمارے بچے مدارس کی ٹھہری ہوئی زمین پر اور اسکولوں کی گھومتی ہوئی زمین پر ذہنی تضادات کا شکار رہیں گے؟ انہوں نے بڑی صفائی سے کہا کہ اگر حرکت زمین کا نظریہ صحیح ثابت ہوجاتا ہے یا زمین کا ساکن ہونا باطل ثابت ہوجاتا ہے تو اس ایک "بات" سے اعلیٰ حضرت کا علمی کمال ہرگز مجروح نہیں ہوگا- میں نے کہا حضرت یہاں فرد واحد کے علمی کمال کے مجروح ہونے نہ ہونے کا سوال نہیں ہے، حرکت زمین کا نظریہ فوزمبین میں دلائل نقلیہ سے بھی باطل کیا گیا ہے، اس لیے حرکت زمین کا نظریہ اسلامی نظریہ سے متصادم ہے لہٰذا اس کے دوررس اثرات پر بھی آپ غور فرمائیں-

پروفیسر مسعود صاحب سے میں نے اپنی دونوں ملاقاتوں میں خاص طور سے فوزمبین کا ذکر اس لیے کیا تھا کہ ان کے پاس غیر محدود وسائل ہیں، افراد کی بھی کمی نہیں ہے- ادارہ تحقیقات امام احمد رضا کا بھرپور تعاون بھی انہیں حاصل ہے، اس لیے اگر پروفیسر صاحب صدق دلی سے اس پر توجہ فرماتے

تو کوئی مفید نتیجہ برآمد ہو سکتا تھا، لیکن اس موضوع پر خاموشی بجائے خود قارئین کو کسی خاص نتیجہ تک پہنچنے میں مددگار ثابت ہو رہی ہے، خدا کرے میری بات صحیح نہ ہو۔

پروفیسر صاحب کو جب علم ہوا کہ میں حدائق بخشش کے اغلاط کتابت کی تصحیح کا کام کر رہا ہوں تو وہ بہت خوش ہوئے، پاکستان سے فون پر میری حوصلہ افزائی فرمائی۔ معارف رضا کے مدیر صاحبزادہ سید وجاہت رسول نے ایک طویل خط کے ذریعہ مبارک باد دی جس میں پروفیسر صاحب کا بھی حوالہ تھا، جب ۱۹۹۷ء میں میں اپنے کام کی تکمیل کے قریب پہنچا تو میرے ایک محسن نے پروفیسر صاحب کا مدونہ "انتخاب حدائق بخشش" کا نسخہ عطا کیا۔ میں نے اسے از اول تا آخر پڑھا درج ذیل عبارت پر میری توجہ خاص طور پر مرکوز ہوئی۔

"ماضی میں اس کے بیسیوں ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں، مگر کوئی ایسا معیاری اور خوبصورت ایڈیشن نظر نہ آیا جو دنیائے ادب میں فخر کے ساتھ پیش کیا جا سکے۔" (ص ۳۰۴)

یوں پروفیسر صاحب نے اس انتخاب کو خوب سے خوب تر بنا کر دنیائے ادب کے سامنے فخریہ طور پر پیش کر دیا، اس سے بطور نتیجہ یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ یہ انتخاب اغلاط کتابت سے پاک ہے۔ ایک طرف ہمارے پیش نظر پروفیسر صاحب کی بھاری بھرکم شخصیت اور ان کا یہ ادعا دوسری طرف تصحیح اغلاط میں ہماری محنت و عرق ریزی، ہم نے اپنے مصحح نسخہ کے مطابق پروفیسر صاحب کے مدونہ نسخہ کو نہیں پایا تو انتخاب حدائق کے اغلاط کتابت کی ایک فہرست بنا کر اپنے مصحح نسخہ میں چھاپ دی تا کہ شعر کے اغلاط کا الزام شاعر کے سر نہ جائے، اس کے علاوہ ہمارا اور کوئی مقصد نہ تھا، مثال کے طور پر:

آنکھیں رو رو کے سوجانے والے
جانے والے نہیں آنے والے

(ص ۱۷۳)

قدیم رسم الخط میں "سجانے" کو "سوجانے" لکھا جاتا تھا، پروفیسر صاحب نے یہ املا شاید صرف اسی شعر میں باقی رکھا ہے۔ اس کا نقصان یہ ہوا کہ پاکستان سے ۱۴۱۴ھ میں "مطلب ہائے سخن رضا" نامی ایک کتاب شائع ہوئی ہے، اس میں اس شعر کا یہ مطلب بیان کیا گیا ہے۔

''جو اس دار فانی سے چلے گئے اب وہ دوبارہ دنیا میں نہیں آئیں گے، تیرا ان کے لیے رونا بے کار ہے۔ تجھ کو بھی نیند آجائے گی۔'' (۱۷۴)

دیکھا آپ نے ''سو جانے'' سے شارح کو کیا دھوکا ہوا۔

یونہی اس شعر کا

جبین طبع، ناسودہ داغ شاگردی سے
غبار منت اصلاح سے ہے دامن دور

(۲۷۵)

پہلا مصرع کسی بحر و وزن میں نہیں ہے۔

اس طرح ہم نے ۵۲ اغلاط کتابت کی ایک فہرست بنادی اور آخر میں لکھ دیا ''انتخاب والا نسخہ جن حضرات کے ہاتھوں میں ہے وہ معروض ہذا کے مطابق اپنا نسخہ درست کرلیں اور محترم پروفیسر صاحب سے التماس ہے کہ اس انتخاب کے طبع ثانی کو بہ ہمہ جہت خوبصورت اور معیاری بنانے کی طرف توجہ فرمائیں۔''

(حدائق بخشش مصححہ احقر ص ۶۶)

پروفیسر ڈاکٹر مسعود احمد مجددی

باایں ہمہ درد دل جانان خود ت خوانم

دوسری اور آخری قسط
(شمارہ نومبر ۲۰۱۰ء)

۱۹۹۷ء کے بعد میں پروفیسر صاحب کی نوازشوں سے محروم رہا۔ مکتوب کے ذریعہ رابطہ رہا، مکتوبات مسعودی میں میرا ابھی ایک خط شامل ہے۔ دیگر خطوط شامل نہ کرنے کی وجہ شاید یہ رہی ہو کہ وہ تنقیدی مواد پر مشتمل تھے، مثلاً ایک تفصیلی خط ۱۳؍رمضان المبارک ۱۴۱۵ھ کو لکھا گیا جس کے آخری پیراگراف کی یہ عبارت شاید اس خط کی اشاعت کے لیے مانع ہوئی:

''آپ نے ایک عنوان تاریخ گوئی کا قائم کیا ہے، اس سلسلہ میں مؤدبانہ گزارش ہے کہ حضرت امام کی تاریخ گوئی سے متعلق جو عبارات بطور حوالہ پیش فرمائیں، انہیں بذات خود ملاحظہ فرمالیں اور حساب لگانے کے بعد ہی ان کو شائع کریں، کیوں کہ تاریخی کتابوں کے علاوہ جن اشعار یا عبارات سے حضرت امام نے سنہ تاریخ کا استخراج کیا ہے، ان کو ہمارے مضمون نگاروں نے اس قدر مسخ کردیا ہے کہ الامان والحفیظ، معارف رضا ۱۹۸۶ء میں جناب عبدالحکیم اختر شاہجہانپوری کا مضمون بہ عنوان ''اعلیٰ حضرت کی نعت گوئی'' شائع ہوا ہے، آپ کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ مضمون نگار نے خود حساب لگانے کی زحمت نہیں اٹھائی، اگر کتابوں کی فہرست کو الگ کرلیا جائے جن سے سنہ تاریخ برآمد ہوتا ہے تو دیگر اشعار و عبارات کے تقریباً نصف حصہ سے مطلوبہ تاریخ برآمد نہیں ہوتی۔ ظاہر ہے یہ فساد مسخ عبارت کے نتیجہ میں پیدا ہوا ہے۔''

اسی مضمون کا ایک خط اسی تاریخ میں صاحبزادہ سید وجاہت رسول کو بھی ارسال کیا گیا تھا، انہوں نے خط کے ذریعے مجھ سے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا کہ جناب عبدالحکیم شاہجہانپوری کے مضمون میں جو اغلاط کتابت راہ پاگئی ہیں ہمیں ان کو درست کر کے بھیج دیجئے، معارف رضا میں ''تصحیح'' شائع کردی جائے گی۔

۱۹۹۷ء میں حدائق بخشش نسخہ رضا اکیڈمی کی اشاعت کے بعد جب اس کے نسخے پاکستان پہنچے تو وہاں کے اہل علم میں اس کی خاصی پذیرائی ہوئی۔خطوط اور فون کے ذریعہ مبارک باد بھی ملی۔مولانا عبدالحکیم شرف قادری نے حدائق بخشش کی تقدیم میں بعض اشعار کی تشریح کی کھل کر داد دی۔" کچھ انتخاب حدائق بخشش کے تعلق سے" کے بارے میں انہوں نے لکھا کہ جو لوگ پروفیسر مسعود کے معتقد ہیں، ان کے علاوہ ہر ایک نے متذکرہ "انتخاب" کے اغلاط کی نشاندہی پر خوشی کا اظہار کیا، البتہ پروفیسر مسعود صاحب اپنے غصہ پر قابو نہ رکھ سکے اور نہایت تلخ لہجے میں ایک خط الحاج محمد سعید نوری کو لکھا، نوری صاحب نے اس خط کی زیروکس کاپی میرے پاس بھیج دی، میں نے اس تحریر کا جواب بلا تاخیر ۲۹؍اپریل ۱۹۹۸ء کو نوری صاحب کی خدمت میں ارسال کر دیا جو درج ذیل ہے، اس خط میں پروفیسر صاحب کے مکتوب کے بعض اقتباسات سے ان کے فکر و مزاج اور دل برداشتگی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے:

محترم الحاج محمد سعید نوری صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

مرسلہ لفافہ ملا، شکریہ، "رضا اکیڈمی بمبئی" کے نسخہ حدائق بخشش کی اہمیت، انفرادیت اور اس کے اصح النسخ ہونے کی بنیاد تقدیم کی انہیں عبارات پر ہے جن میں دیگر نسخوں کے اغلاط کی نشاندہی ہے، اگر انہیں حذف کر دیا جائے تو حضرت شمس بریلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اور محترم پروفیسر محمد مسعود احمد کے مدونہ نسخوں کو برتری حاصل ہوگی، کیوں کہ عالم اسلام میں یہ دونوں حضرات ماہر رضویات کی حیثیت سے اپنی پہچان بنا چکے ہیں، ان قد آور شخصیتوں کے آگے شر مصباحی بے حقیقت ہے۔

مجھے محترم پروفیسر صاحب کی یہ پہلی تحریر نظر آئی، جس میں نہ صرف ربط و تسلسل کا فقدان ہے، بلکہ الفاظ ان کے مافی الضمیر کی رفاقت بھی نہیں کر رہے ہیں۔آپ کے پاس خط کی اصل کاپی ہے، اس کے دوسرے صفحے کی یہ عبارت پڑھئے" پھر ان اغلاط کا تعلق دین سے نہیں ادب سے تھا" اور اسے پچھلی عبارات سے جوڑیے اور سر دھنیے۔

محترم! مجھے دکھ اس بات کا ہے کہ غلط مندرجات کی صحیح گرفت پر موصوف چراغ پا ہو گئے اور

سرکار اعلیٰ حضرت کے دیوان کے صحیح مندرجات کو غلط تحریر کرنے (نقل کرنے) پر ایک حرف ندامت بھی ان کے قلم کا شرمندۂ احسان نہیں ہوا، الٹے کاتب کو مورد الزام ٹھہرایا۔

میرے پاس رضا اکیڈمی بمبئی کا نسخۂ حدائق نہیں ہے، ایک عدد بھیج کر جو آپ نے کرم فرمایا تھا وہ حافظ قمر الدین صاحب لے گئے، ورنہ چند مثالیں پیش کرتا کہ اشعار کی کیسی درگت کی گئی ہے۔ ہرچند یہ قصداً نہیں ہے، لیکن سہواً بھی نہیں ہے۔ آخر آپ نے بھی تو کاتبوں سے کام لیا ہے؟ پروف ریڈنگ میں اگر تساہلی برتی جائے یا اس کو غیر ضروری عمل سمجھا جائے یا یہ کام انتہائی حزم و احتیاط اور دقت نظر سے نہ کیا جائے اور غلطیاں باقی رہ جائیں تو اس میں کاتب کا کیا قصور ہے؟

رہی یہ بات کہ شرر مصباحی کے لہجے میں تندی آگئی، مجھے یہ تسلیم ہے۔ یہ میری مجبوری تھی۔ اس کو آپ اس پہلو سے ملاحظہ کریں کہ اپنی عزت نفس پر آنچ آئی تو حضرت موصوف نے یہاں تک لکھ دیا کہ "امام احمد رضا نے جو احتیاط دشمنانِ دین کے ساتھ روا رکھی وہ فاضل تقدیم نگار نے دوستوں کے ساتھ بھی روا نہ رکھی" اور سرکار اعلیٰ حضرت کے فکر و فن پر بے سبب آنچ آئی تو میری دفاعی تحریر گستاخانہ اور ادب سے فروتر نظر آنے لگی۔ شرر مصباحی

آخری خط جو میں نے پروفیسر مسعود کی خدمت میں ارسال کیا، جس کے جواب کی نہ امید تھی نہ جواب آیا، لیکن خط کا مضمون ایسا نہیں ہے، جس سے صرف نظر کیا جاسکے، اس لیے اس کی نقل درج ذیل ہے:

محترم پروفیسر مسعود احمد مظہری صاحب السلام علیکم

بخیر ہوں! معروض خدمت کہ علمائے پاکستان کی تحریریں جو رسائل و جرائد میں شائع ہوتی رہتی ہیں، ان سے ظاہر ہے کہ وہ علامہ اقبال کو ایک عظیم مرد مومن جانتے ہیں، تقسیم ہند کے بعد مسٹر جناح اور علامہ اقبال کا عقیدہ کبھی بھی ان کے یہاں معرض بحث نہیں رہا، لیکن با ایں ہمہ میں نے علمائے پاکستان کی تحریروں میں کہیں بھی علامہ اقبال کے نام کے ساتھ رحمۃ اللہ علیہ یا غفر اللہ لہ جیسے کلمات نہیں دیکھے حتیٰ کہ امام احمد رضا اور علامہ اقبال کے عشق رسول کا (غیر ضروری) تقابلی مطالعہ بھی بعض علما نے کیا ہے، کتابچے لکھے ہیں، ان میں اعلیٰ حضرت کو رحمۃ اللہ علیہ اور رضی اللہ عنہ لکھا گیا ہے، علامہ اقبال کو نہیں۔ یہاں ترحم اور ترضی کے الفاظ کا نہ لکھا جانا قصداً معلوم ہوتا ہے۔ اگر ان علما کی نگاہ میں

تجانب اہل سنت کا فتویٰ اور اس کی تصدیقات تھیں، جن کی وجہ سے وہ رحمۃ اللہ علیہ یا غفراللہ لہ لکھنے سے احتراز کرتے رہے تو اس احتیاط سے اپنا دامن ایمان بچانا اور ''مرد مومن''، ''سچا عاشق رسول'' لکھ کر عامۃ المسلمین کو رحمۃ اللہ علیہ اور غفراللہ لہ کہنے کا جواز فراہم کرنا کیا شرعی نقطۂ نظر سے صحیح ٹھہرایا جاسکتا ہے، اگر صحیح وہی ہے جو وہ لکھتے آئے ہیں تو پھر تجانب اہل سنت کے فتویٰ کو مسترد کیے جانے میں کون سے عوامل مانع ہیں، اس کی وضاحت ہوجانی چاہیے اور یہ کہ جواب مرحمت فرمائیں۔ شرر مصباحی ۱۳،۹،۲۰۰۱ء

بلاشبہ اعلیٰ حضرت کے فکر وفن کی اشاعت میں اپنی عمر عزیز کا بڑا حصہ پروفیسر صاحب نے صرف کیا ہے۔ بلاد عرب میں اعلیٰ حضرت کا علمی تعارف آپ کے مشن کا حصہ تھا۔ ابھی حال ہی میں رضوی کتاب گھر جامع مسجد دہلی میں مجھے تفسیر مظہری دیکھنے کا اتفاق ہوا، اس کے حصہ اول میں پروفیسر صاحب کا طویل مقدمہ ہے اور دوسرے حصے میں انہوں نے اس بات کی تصدیق فرمائی ہے کہ تفسیر مظہری کا بین السطور ترجمہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے فارسی ترجمہ قرآن کا اردو ترجمہ ہے۔

میں نے رضوی کتاب گھر کے پروپرائٹر حافظ قمر الدین رضوی سے کہا کہا غیار نے جن آیات کا گستاخانہ ترجمہ کیا ہے، ان آیات کا شاہ ولی اللہ صاحب نے کیا ترجمہ کیا ہے تفسیر مظہری کے اردو ترجمہ سے یہ ظاہر ہوجائے گا۔ ان آیات مبارکہ کا ترجمہ دیکھا گیا تو بلاکم وکاست پوری کی پوری عبارت وہی نکلی جو کنز الایمان میں ہے، حافظ جی نے کہا کہ کنز الایمان کے آفس میں مولانا رضاء المصطفیٰ ابن صدر الشریعہ کا ایک کتابچہ موجود ہے، جس میں ان آیات مبارکہ کے متعدد اردو تراجم کے ساتھ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کا فارسی ترجمہ بھی مذکور ہے، قارئین کو یہ جان کر صدمہ ہوگا کہ حضرت شاہ ولی اللہ کے ترجمہ فارسی سے تفسیر مظہری کے ترجمہ اردو کا دور کا بھی واسطہ نظر نہیں آیا، پھر ایسا کیوں کیا گیا، اس میں کیا مصلحت تھی اور یہ کس دخل مقدر کا جواب تھا، آج اگر پروفیسر صاحب ہمارے درمیان موجود ہوتے تو میں ان سے ضرور دریافت کرتا۔ افسوس کہ گلشن رضویات کا یہ بلبل خوش نوا جس کی صوت وصدا ''زبور'' کے مزمار داؤدی کی یاد دلاتی رہتی تھی، ہمیشہ کے لیے زباں درکشیدہ ہوگیا۔

تفسیر مظہر القرآن اور پروفیسر مسعود احمد دہلوی

(جولائی ۲۰۱۱ء)

موقر جام نور" تذکار" کالم میں پروفیسر محمد مسعود احمد مجددی کا ذکر تفصیل سے کیا جا چکا ہے اور اپنی استعداد کے مطابق ان کے علمی کارناموں کو سراہا بھی ہے، البتہ جہاں تفسیر مظہر القرآن کا ذکر آیا ہے جو حضرت مرحوم ہی کے زیر اہتمام اور بسیط مقدمہ کے ساتھ رضوی کتاب گھر دہلی سے شائع ہوئی ہے، جس میں اس امر کی صراحت ہے کہ یہ تفسیر اور ترجمہ مفتی اعظم حضرت شاہ مظہر اللہ نقشبندی رحمۃ اللہ علیہ کا ہے اور اس امر کا کھلا اعتراف بھی کہ یہ ترجمہ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے فارسی ترجمہ کا اردو ترجمہ ہے- یہاں میں ان کی تحریر سے مطمئن نہیں ہوا کیوں کہ جب میں نے شاہ صاحب کے ترجمہ فارسی اور تفسیر مظہر القرآن کے ترجمہ کا مقابلہ کیا تو مجھے مطابقت نظر نہیں آئی بلکہ واضح اختلاف دکھائی دیا اور بہت سے مقامات پر آیات کریمہ کے ترجمے میں شاہ صاحب کے ترجمہ فارسی کے اردو ترجمے کی جگہ کنزالایمان کی پوری کی پوری عبارت نظر آئی - یہ میرے لیے باعث حیرانی تھا اسی لیے میں نے لکھ دیا تھا کہ" آج اگر پروفیسر صاحب ہمارے درمیان موجود ہوتے تو میں ان سے ضرور دریافت کرتا"- (شمارہ: نومبر ۲۰۱۰ء)

لیجیے اب حقیقی صورت حال سامنے آگئی ہے، میں نے مفتی اعظم شاہ مظہر اللہ مجددی نقشبندی رحمۃ اللہ علیہ کے نبیرہ محترم قاضی اہل سنت حضرت علامہ مفتی محمد میاں صاحب ثمر دہلوی مدظلہ العالی سے خط کے ذریعہ استصواب کیا تو انہوں نے بلا تاخیر جواب سے شاد کام کیا- اپنا عریضہ اور قاضی اہل سنت کا جواب قارئین جام نور کی ضیافت طبع کے لیے پیش ہے:

محترم مفتی صاحب! السلام علیکم ورحمۃ اللہ

بخیر ہوں، پاکستان کی ایک ملی تنظیم کی جانب سے مجھے" ترجمہ وتفسیر مظہر القرآن اور کنزالایمان کا تقابلی جائزہ" کے عنوان کے تحت مقالہ لکھنے کی دعوت ملی ہے- اس موضوع پر اظہار خیال سے پہلے بعض امور میں آپ سے استصواب کرنا چاہتا ہوں-

تفسیر مظہر القرآن جو کہ آپ کی نظر ثانی کے بعد پروفیسر مسعود احمد نقشبندی کے زیر اہتمام رضوی کتاب گھر دہلی سے ۲۰۱۰ء میں طبع ہوئی ہے، اس میں پروفیسر صاحب نے تصدیق کی ہے کہ تفسیر کے ساتھ جو ترجمہ ہے وہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے فارسی ترجمہ کا اردو ترجمہ ہے- ڈاکٹر مجید اللہ قادری (پاکستان) نے جو مقالہ بہ عنوان "کنزالایمان اور معروف تراجم قرآن" پروفیسر مسعود کی رہنمائی میں مکمل کیا ہے اس میں بھی صفحہ 705 پر اس کی صراحت ہے- اس وقت میرے سامنے شاہ صاحب کا فارسی ترجمہ قرآن ہے جو ۱۲۹۹ھ میں مطبع مجتبائی دہلی سے طبع ہوا ہے غالباً یہ وہی نسخہ ہے جو اعلیٰ حضرت کے پیش نظر تھا- جب آپ نے ۱۳۳۰ھ میں کنزالایمان کے نام سے ترجمہ قرآن کا آغاز کیا تھا- یہاں جو کچھ معروض ہے وہ اسی نسخہ کے حوالہ سے ہے- اگر کوئی اور قدیمی نسخہ آپ کی نگاہ میں ہو جس کی عبارات سے محولہ نسخہ کی عبارتیں میل نہ کھاتی ہوں تو اس کا ذکر اپنے جواب میں ضرور کریں-

استصواباً عرض ہے کہ مظہر القرآن کی بہت سی عبارات کا مقابلہ شاہ صاحب کے فارسی ترجمے کی عبارتوں سے کیا گیا مجھے تو دور کا بھی تعلق نظر نہیں آیا نہ اس دعویٰ میں کوئی دم نظر آیا کہ تفسیر مظہر القرآن میں مفتی اعظم حضرت شاہ مظہر اللہ علیہ الرحمہ نے شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے فارسی ترجمے کو اردو مین منتقل کیا ہے- ذیل میں چند آیات مبارکہ کے تحت دونوں ترجمے نقل کیے جاتے ہیں دونوں کا فرق بلکہ اختلاف ظاہر ہے، فارسی ترجمہ شاہ ولی اللہ صاحب کا ہے اور اردو ترجمہ تفسیر مظہر القرآن سے منقول ہے-

(۱) وَمَكَرُوْا وَمَكَرَ اللّٰهُ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ

و بدسگالیدند کافراں و بدسگالید خدا و خدا قوی تراست از ہمہ بدسگالاں-

اور ان کافروں نے برا ارادہ کیا اور اللہ نے ہلاک کی خفیہ تدبیر کی اور خدا سب سے بہتر چھپی تدبیر والا ہے-

(۲) لِيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ

عاقبت فتح آنست کہ بیامرزد ترا خدا آنچہ کہ از سابق گزشت از گناہ تو و آنچہ پس ماندہ-

تا کہ اللہ تمہارے سبب سے گناہ بخشے تمہارے اگلوں اور تمہارے پچھلوں کے-

(۳) اللہ یستھزئ بھم
خدا تمسخر کند بایشاں
یہ لوگ مسلمانوں سے کیا دل لگی کریں گے (حقیقت میں) اللہ ان کو ان کی ہنسی کا بدلا دیتا ہے۔

(۴) قَالُوا تَاللّٰهِ إِنَّكَ لَفِي ضَلٰلِكَ الْقَدِيْمِ
گفتند بخدا ہر آئینہ تو در خطائے قدیم خودی
اللہ کی قسم تم اپنی پرانی خود رفتگی میں پڑے ہوئے ہو۔

(۵) اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَهُوَ خَادِعُهُمْ۔
ہر آئینہ منافقاں فریب می کنند با خدا و خدا نیز فریب می کند بایشاں۔
بے شک منافق لوگ اپنے گمان میں خدا کو فریب دیا چاہتے ہیں اور وہی انہیں غافل کر کے مارے گا۔

(۶) لَآ اُقْسِمُ بِهٰذَا الْبَلَدِ ۝۱ وَاَنْتَ حِلٌّۢ بِهٰذَا الْبَلَدِ ۝۲
قسم می خورم بایں شہر مکہ مبارک و تو حلال خواہی شد بایں شہر
مجھے اس شہر (مکہ مکرمہ) کی قسم کہ (اے محبوب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تم اس شہر میں تشریف فرما ہو۔

(۷) وَلَلْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰى
و ہر آئینہ آخرت بہتر خواہد بود ترا از دنیا
اور بے شک تمہارے لیے (بعد میں آنے والی ہر حالت) پہلی سے بہتر ہے۔

(۸) مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ
نمی دانستی تو کہ چیست کتاب و نمی دانستی کہ چیست ایمان
اس سے پہلے نہ تم کتاب جانتے تھے نہ احکام شرع کی تفصیل۔

(۹) وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى ۝۷
و یافت ترا راہ گم کردہ پس راہ نمود

اور اس نے تم کو اپنی محبت میں خود رفتہ پایا تو اپنی طرف راہ دی۔

(۱۰) قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰى اِلَيَّ

بگو جز ایں نیست کہ من آدمی ام مانند شما وحی فرستادہ شود بسوئے من۔

تو فرماؤ ظاہر صورت میں تو میں تم جیسا بشر ہوں مجھے وحی آتی ہے۔

یہ محض چند مثالیں ہیں جو پیش کی گئی ہیں، شاہ صاحب کے ترجمہ فارسی اور تفسیر مظہر القرآن کے ترجمہ اردو میں معنوی فرق جگہ جگہ دیکھا جا سکتا ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ اسی کا تفصیلی جواب مطلوب ہے تاکہ آپ کے جواب سے رہنمائی حاصل کر کے اپنا مقالہ مکمل کرسکوں!

والسلام   احقر شرر مصباحی

۲۸ مارچ ۲۰۱۱ء

بملاحظہ حضرت مولانا مفتی محمد میاں صاحب بالقابہ

گلی مفتی والی، باڑہ ہندو راؤ، دہلی-۶

قاضی اہل سنت کا جواب:

مخلصم جناب ڈاکٹر فضل الرحمن صاحب شرر مصباحی!

وعلیکم السلام والرحمہ والبرکہ

بفضلہ تبارک وتعالیٰ بخیر علیل ہوں۔ ۱۵/اپریل کو آپ کا ۲۸/مارچ کا محررہ مکتوب مجھے آج قبل ظہر موصول ہوا۔ ہوسکتا ہے میرے بیرون سفر ہونے کے دوران آیا ہو۔

جواباً تحریر ہے کہ، کافی عرصہ ہوا حافظ قمر الدین صاحب رضوی کتاب گھر والوں نے تفسیر مظہر القرآن کا پاکستانی نسخہ بھیج کر اس پر کچھ لکھنے کی خواہش کی تھی میں نے اسے جستہ جستہ دیکھا بھی تھا، مگر مطمئن نہ تھا کہ وہ حضرت جدامجد علیہ الرحمہ کا ترجمہ ہے اس لیے بغیر کچھ لکھے انہیں واپس کر دیا تھا کیونکہ مجھے خوب یاد ہے کہ میں مدرسہ عالیہ عربیہ مسجد فتحپوری دہلی میں ابتدائی عربی میں زیر تعلیم تھا تو کاکوان خاندان کے خلیل الرحمن صاحب کی اہلیہ جو حضرت جدامجد علیہ الرحمہ کے خصوصی ارادت

مندوں میں تھیں وہ ترجمہ قرآن کریم اور ابتدائی عربی پڑھنے آیا کرتی تھیں - راقم اور وہ حضرت سے ساتھ ہی پڑھتے تھے، متعدد آیات کریمہ سے متعلق مختلف تراجم کے تقابلی جائزہ کے لیے اکثر مترجمین کے ترجموں کی اغلاط کی وضاحت فرمایا کرتے تھے، لیکن نہ تو اس وقت ترجمہ وتفسیر مظہر القرآن کا نام آیا اور نہ کبھی فرمایا کہ آپ نے بھی کوئی ترجمہ تحریر فرمایا ہے- اس کے علاوہ حضرت عم محترم پروفیسر محمد مسعود صاحب علیہ الرحمہ جب بھی پاکستان سے دہلی آتے تھے تو عرصہ قیام میں شب وروز ان کے ساتھ رہتا تھا اور علمی گفتگو رہتی تھی اور چونکہ مزاج میں تحقیق کا وصف غالب تھا اس لیے کسی اہم مسئلہ پر صرف میرے بتا دینے سے مطمئن نہیں ہوتے تھے جب تک اس کے حوالہ جات نہ معلوم کرلیں، لیکن ماضی کی ان ملاقاتوں میں جو برسوں میں پھیلی ہوئی تھیں کبھی اس ترجمہ وتفسیر کا نام تک بھی نہیں آیا، اگر اس نام کا ترجمہ وتفسیر ان کے علم میں ہوتا تو ایک بار نہیں بار بار اس کا تذکرہ ناگزیر تھا- ۱۵/اپریل ۲۰۱۱ء

دستخط مہر

رہی یہ بات کہ میں نے پروفیسر صاحب کی عظمت پر انگلی اٹھائی ہے یا پروفیسر صاحب نے انتخاب حدائق بخشش کے اغلاط کی تصحیح قبول نہیں کی، یہ صحیح نہیں ہے، پروفیسر صاحب کی عظمت شان میں جو کچھ حسب توفیق لکھا جا سکتا تھا لکھا گیا ہے، انتخاب حدائق بخشش کی اغلاط کی جو نشاندہی کی گئی تھی اسے بھی انہوں نے قبول کیا تھا بس انہیں شکوہ یہ تھا کہ ان اغلاط کی فہرست شائع کرنے کی بجائے ذاتی طور پر انہیں باخبر کرنا چاہیے تھا- اس مضمون کا خط الحاج محمد سعید نوری رضا اکیڈمی ممبئی کو پروفیسر صاحب نے لکھا تھا آں موصوف سے تصدیق کی جا سکتی ہے-

فوزمبین کے تعلق سے جو کچھ جام نور شمارہ مئی ۲۰۱۱ء میں لکھا گیا ہے اس کے بارے میں اس کے سوا کیا کہہ سکتا ہوں کہ پروفیسر صاحب سے جو گفتگو ہوئی تھی بلا کم وکاست اسے معرض تحریر میں لایا گیا ہے- اس میں پروفیسر صاحب کی عظمت شان پر کیا حرف آتا ہے؟

ڈاکٹر مکرم احمد صاحب اپنے چچا کا قصیدہ پڑھ چکے اور ان کا دفاع کر چکے تو اب پہلو

بدلتے ہوئے اس ہچمرز کی تذلیل کے لیے یوں گویا ہوئے: ''کاش کوئی دیدہ ور ہمیں بتادے کہ فاضل ڈاکٹر صاحب موصوف کس فن پر اتھاریٹی ہیں؟ان کے کتنے مقالات شائع ہو چکے ہیں؟ان کی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کتب کی تعداد کتنی ہے؟ان کا پی ایچ ڈی کا مقالہ کس موضوع پر ہے؟'' (جام نور، مئی ۲۰۱۱ء)

یہ جملے بڑے سطحی، غیر علمی اور ڈاکٹر مکرم احمد کی منزلت سے فروتر ہیں- دیدہ ور حضرات کو الٹی دیکھتے ہیں کوانٹیٹی نہیں، ورنہ ڈاکٹر ادریس ڈاکٹر مکرم احمد سے بازی مارلے جائیں- جہاں تک پی ایچ ڈی کا مقالہ اور اس کے موضوع کی بات کہی گئی ہے، احقر ضرور اس خیر سے محروم ہے اور اس کی بدولت ڈاکٹر صاحب کا علمی قد ان اکابر سے بھی اونچا ہے جنھیں پی ایچ ڈی کی ڈگری نصیب نہیں-

افسوس تو اس بات کا ہے کہ ''تذکار'' میں جس تشویش اور حیرانی کا اظہار کیا گیا تھا اس کا کوئی جواب نہیں دیا گیا- تحدیث نعمت کا اظہار بھی ہمارے بزرگوں کی سنت ہے، اس لیے خاص طور پر مفتی مکرم احمد صاحب سے مخاطب ہوں کہ آپ کے علم میں یہ بات ضرور ہوگی کہ آپ کے جدامجد مفتی اعظم حضرت شاہ محمد مظہر اللہ مجددی نقش بندی کی نماز جنازہ حضرت علامہ ابوالحسن زید مجددی نقش بندی نے پڑھائی تھی، جن کا عرس مبارک ابھی یکم جون کو اختتام پذیر ہوا، آپ کو یہ بھی علم ہوگا کہ قبلہ زید میاں کی مشہور زمانہ تصنیف ''سوانح بے بہائے امام اعظم ابوحنیفہ'' کا مسودہ ایک خاص ہدایت کے ساتھ مجھے دیا گیا تھا جس کو حرف حرف پڑھ کر واپس کیا گیا تھا، آپ کو یہ بھی پتا ہوگا کہ متذکرہ تاریخی نام احقر ہی کا تجویز کردہ ہے جس سے ۱۴۱۰ھ برآمد ہوتا ہے، مگر آپ کو یہ علم نہیں کہ اس بے نظیر کتاب پر تبصرہ اور اظہار خیال کے لیے اس نادرۂ روزگار نے اسی ناچیز کا انتخاب کیا تھا (یہ تبصرہ کتاب میں شامل ہے) جب کہ باعث نسبت کذائی دونوں ڈاکٹر صاحبان موجود تھے، ایک ہندوستان میں دوسرے پاکستان میں-

خامہ تلاشی: جام نور کا ایک یادگار کالم

[جام نور کا خصوصی ۱۰۰ / رواں شمارہ]

مولانا خوشتر نورانی کو خدا سلامت رکھے گرم لوہے پر چوٹ کرنے کا ہنر انہیں خوب آتا ہے اور کوئی موقعِ غنیمت ہاتھ سے جانے نہیں دیتے - جام نور کا زیر نظر سواں شمارہ انہوں نے تحریک جام نور کے تعلق سے مشاہیر علم وادب کی نگارشات اور تاثرات کے لیے مخصوص کیا ہے جس کی چند جھلکیوں میں ''خامہ تلاشی'' جام نور کا ایک یادگار کالم'' بھی ہے- اس عنوان کے تحت مجھے اپنے تاثرات پیش کرنے کا حکم ہوا ہے جب کہ آں موصوف کو میرا یہ جملہ از بر ہے کہ ''اب خامہ تلاش کا انتقادی قلم علم سے زیادہ پندار علم کا ڈھنڈورچی ہو گیا ہے''

خوشتر صاحب نے خامہ تلاشی کے اس مخصوص کالم کے مندرجات از اپریل ۲۰۰۵ء تا دسمبر ۲۰۰۶ء بہ شمول تعاقب وتاثرات ارباب علم کے تاثرات کتابی شکل میں شائع کر دیے ہیں جو اس وقت میرے پیش نظر ہیں- میرے متذکرہ تبصرہ کے باوجود خوشتر صاحب نے خامہ تلاشی پر تاثرات قلم بند کرنے کا حکم دیا ہے اسے میں آں موصوف کی غیر معمولی ذہانت سمجھتا ہوں انہوں نے ٹھان لی ہے کہ انہیں تِلوں تیل نکلے گا اور میں بھی تُلا بیٹھا ہوں کہ اپنی شکست کا جشن منا کر رہوں گا-

جب جام نور میں ''خامہ تلاشی'' کا کالم روشناس ہوا اور ابو الفیض معینی کے نام سے رسالہ میں طبع شدہ نظم ونثر پر بے لاگ تبصرے شائع ہونے لگے تو میں بھی اُن خوش نصیبوں میں تھا جن کو نہ صرف جام نور کے تازہ شمارہ کا بے صبری سے انتظار رہا کرتا تھا بلکہ رسالہ موصول ہونے کے بعد اداریہ اور خامہ تلاشی کا مطالعہ میری ترجیحات میں تھا- بہت دنوں تک قارئین کو پتا نہ تھا کہ ابو الفیض معینی کون بزرگ ہیں- بعض اہلِ علم بھی تیہِ حیرت میں بھٹکتے رہے لیکن جب مولانا ملک الظفر اور پروفیسر فاروق احمد صدیقی جیسے اہل نظر بھی سرگرداں نظر آئے تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی کیوں کہ مجھ بے بضاعت کی نگاہ فکر نے خامہ تلاش کو جام نور کے بام تجلی پر پوری تمکنت کے ساتھ نمودار ہوتا

دیکھ لیا تھا، وہ کیسے؟ وہ ایسے:

ابوالفیض معینی ایک نیا نام تھا جس نے روز اول ہی سے اپنے علم وفن کا مظاہرہ کرکے قارئین کے دلوں کو مسخر کرلیا تھا- ظاہر ہے ایسا متبحر، وسیع الاطلاع، صاحب بصیرت، خوش فکر وخوش بیان قلم کار ایک دم سے زمین کا سینہ چیر کر برآمد نہیں ہوسکتا تھا- میں نے جماعت کے معروف اہل علم کی اپنے ذہن میں ایک فہرست مرتب کی، ایک ایک نام پر سر کھپایا، کوئی علم حدیث میں فائق تو عروض وبحور سے نابلد، کوئی منطق وفلسفہ میں کامل تو تاریخ وسیر سے نا آشنا، الغرض ان میں سے کسی میں یک جائی طور پر وہ صفات نظر نہیں آئیں جو ابوالفیض معینی کے رشحات قلم میں تھیں، پھر اسی مجلہ میں مولانا اسید الحق عثمانی کے مضامین زینت نظر ہوتے رہتے تھے جو مختلف اصناف سخن پر محیط ہوتے تھے، مجھے مولانا اسید کے اسلوب نگارش اور مولانا ابوالفیض معینی کے طرز تحریر میں ذرہ برابر فرق محسوس نہیں ہوا اس لیے میں کبھی بھی اندھیرے میں نہیں رہا-

بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش
من انداز قدت را می شناسم

حالاں کہ کئی بار خامہ تلاش نے قارئین کو چکمہ بھی دیا وہ راز کو راز ہی رہنے دینا چاہتے تھے، مثلاً شید البستوی کے مصرع

زندگی بھر ہے کیا جس نے اطاعت ان کی

کو قابل غور بتاتے ہوئے لکھتے ہیں ''یہاں حیدرآباد میں تو اطاعت کی جاتی ہے ممکن ہے بستی میں ''اطاعت کیا جاتا ہو''- اس جملے سے یہ تأثر قائم ہوتا ہے کہ خامہ تلاش کا تعلق سرزمین حیدرآباد سے ہے لیکن اس کے باوجود میں اپنے فیصلہ پر اٹل رہا اور بطور خود میں نے توجیہ یہ کی کہ یہ تبصرہ موصوف نے اپنے حیدرآباد کے سفر کے دوران کیا ہوگا- مزے کی بات تو یہ ہے کہ جہاں خامہ تلاش نے جام نور کے شرکائے قلم کو ہدف نقد بنایا ہے خود کو بھی نہیں بخشا ہے، یہ اس لیے تاکہ پردہ اٹھنے نہ پائے-

خامہ تلاش کی بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ علوم متداولہ پر گہری نظر رکھتے ہیں، اسلوب تحریر بڑا دل پذیر ہے، شعر وادب کے تعلق سے وہ جو بات وثوق سے کہہ سکتے ہیں جس کے لیے ان کے پاس

ٹھوس دلائل ہیں اکثر اسے بھی وہ اپنی فہم ناقص کے حوالے کر دیتے ہیں، یوں مخاطب یا مشارالیہ کی اصلاح بھی ہوجاتی ہے، قارئین رسالہ کی معلومات میں اضافہ بھی ہوتا ہے اور بدگمانی بھی راہ نہیں پاتی- یہ وصف خاص جسے میں خامہ تلاش کا بڑاپن کہتا ہوں جو صرف تعلیم حاصل کر لینے سے نہیں پیدا ہوتا بلکہ یہ اس خانقاہی نظام تربیت کا ثمرہ ہے جہاں سے آدمی انسان بن کر اور مسترشد مرشد بن کر نکلتا ہے اور چٹکیاں لینے میں تو حضرت والا کا کوئی جواب ہی نہیں، ذرا درج ذیل عبارات کی شگفتگی ملاحظہ ہو:

(۱) ''ڈاکٹر صابر سنبھلی صاحب کی نعت شریف اور مناجات دونوں بہت مرصع ہیں ان کی مناجات کا ایک مصرع ہے:

غم فراق میں خوں ریز چشم تر دے دے

''خوں ریز چشم تر'' غالباً جدید ترکیب ہے، اب چونکہ یہ ترکیب صابر صاحب جیسے ماہر فن نے استعمال کی ہے لہذا درست ہی ہوگی''۔

(ص:۷۲)

یہاں قارئین نے محسوس کیا ہوگا کہ خامہ تلاش نے پہلے تو شاعر کو قوت بخش جملوں سے تنومند کیا پھر اس کو دھوبی پاٹ پر ایسی پٹخنی دی کہ سنبھلنے کا موقع تک نہ ملا-

(۲) ''پروفیسر طلحہ رضوی برق کا شمار اساتذۂ سخن میں ہوتا ہے، فن اور زبان دونوں پر ان کی قدرت کسی شک وشبہ سے بالاتر ہے ان کی منقبت ان کی مہارت اور قادر الکلامی پر شاہد ہے ان کے ایک مصرع پر نظر رک گئی:......ع شیر خدا علی کرم اللہ وجہہ

ہماری ناقص معلومات کی حد تک کرم کی را مشدد ہے یا تو ہم اس مصرع کو صحیح پڑھ نہیں پارہے ہیں یا پھر حضرت برق نے کرم کی را کسی عروضی قاعدے کے تحت بجائے تشدید کے تخفیف کے ساتھ نظم کی ہے-'' (ص:۹۸)

دوشیزۂ قلم کی اس رعنائی و برنائی پر ہزار جان سے قربان ہونے کو جی چاہتا ہے-ایک مقام پر فاضل خامہ تلاش نے غریب شرر مصباحی پر بھی کرم فرمایا ہے- تفصیلی معروضہ مضمون کے آخر میں ملاحظہ کریں:

علم حدیث میں خامہ تلاش کی عبقریت مسلم ہے- مولانا اسید الحق کے مضمون ''حدیث افتراق امت'' پر خامہ تلاش رقم طراز ہیں:

''مولانا اسید الحق بدایونی کا مضمون ''حدیث افتراق امت تحقیقی مطالعہ کی روشنی میں'' غالباً ایک طویل مضمون ہے جس کی یہ پہلی قسط ہے، ایک فاضل ازہر سے جس قسم کے تحقیقی مضامین کی توقع کی جاسکتی ہے مولانا اس پر ہمیشہ پورے اترتے ہیں'' (ص:۲۶)

اب جب کہ دنیا کو پتا چل گیا ہے کہ مولانا اسید الحق ہی مولانا ابوالفیض معینی ہیں یعنی دونوں کھوپڑیوں میں ایک ہی دماغ ہے تو صاف ظاہر ہے کہ خامہ تلاش کا اس مضمون کے تعلق سے ایک مقام پر یہ کہنا کہ ''کلها فی النار الاواحده پر انہوں نے (مولانا اسید نے -شرر) تحقیقی بحث کرتے ہوئے اس کو کثرت طرق کی وجہ سے حسن قرار دیا ہے ہماری ناقص رائے میں یہ کوئی قاعدۂ کلیہ نہیں ہے کہ مطلقاً ہر ضعیف الاسناد حدیث تعدد طرق کی وجہ سے حسن قرار دے دی جائے۔'' (ص:۲۶) ایک طرح سے اپنے قول کی تصحیح ہے-

جام نور میں جن دنوں مولانا اسید الحق کا یہ مضمون شائع ہوا تھا میں محدث شہیر شیخ عبداللہ ہرری کے معالج کی حیثیت سے بیروت میں تھا- قارئین کو حیرت ہوگی کہ لگ بھگ سو برس کی عمر میں عینک کا احسان اٹھائے بغیر طویل بیماری کی حالت میں بھی شیخ ہرری روزانہ درس دیتے تھے- الجزائر، مراکش، سوریہ اور مصر کے علما حاضر ہوتے، دوزانو بیٹھتے، مسائل دریافت کرتے، ہر سوال کا جواب شیخ کی نوک زبان ہوتا، ان ایام میں جام نور کے چند شمارے موصول ہوئے، متذکرہ بالا عنوان کا مضمون بغور پڑھنے کے بعد میں نے طے کیا کہ شیخ سے اس حدیث کے بارے میں بات کروں گا- ایک دن بعلبک کے چند علما کی موجودگی میں میں نے شیخ سے پوچھا، کیا تعدد طرق سے حدیث ضعیف حسن قرار پاتی ہے؟ شیخ نے فرمایا احیاناً- معاً فرمایا حدیث اربعین سات طرق سے (یا گیارہ طرق سے- شرر) روایت کی گئی ہے تاہم محدثین وحفاظ نے اسے ضعیف ہی قرار دیا ہے-

خامہ تلاشی میں جہاں مولانا منظر الاسلام ازہری سے نوک جھونک ہوئی ہے وہ خاصے کی

چیز ہے، اہل علم نے اسے دل چسپی سے پڑھا، دونوں ازہری ہیں، علم حدیث میں تقریباً ہم تراز وہیں لیکن یہ سلسلہ آگے نہیں بڑھ سکا۔

میں نے محسوس کیا کہ خامہ تلاش کا بے باک قلم کہیں کہیں مصلحت کا شکار ہو گیا اور خاموشی ہی میں اپنی عافیت سمجھی گئی خاص طور پر ''برق وشرر کی تابشیں'' اور اس سے آگے پیچھے کے شماروں میں جو فنی و لسانی مباحثے ہوئے ہیں وہاں خامہ تلاش کا تبصرہ قارئین کے لیے مشعل راہ بنتا لیکن نہیں ''عافیت ساحل میں ہے'' یاد رہا اور ''موج دریا کا حریف'' ہونا یاد نہیں رہا، حالاں کہ خامہ تلاشی کی ابتدا اسی شعر سے کی گئی تھی۔

کچھ سمجھ کر ہی ہوا ہوں موج دریا کا حریف
ورنہ میں بھی جانتا ہوں عافیت ساحل میں ہے

حقیقت یہ ہے کہ جام نور کے باذوق قارئین نے خامہ تلاشی کو دل چسپی سے پڑھا اور ایسے کالم کے لیے جام نور جیسے بلند معیار اور حقیقت پسند جریدہ سے بہتر کوئی پلیٹ فارم ہو بھی نہیں سکتا تھا میرے نزدیک دونوں آنکھیں برابر ہیں۔

چہ خوش باشد دوشاہد را بہ بحث ناز پیچیدن
نگہ در نکتہ زائیہا نفس در سرمہ سائیہا

یہاں میں اپنے محسوسات پیش کر رہا ہوں، ضروری نہیں کہ قارئین اتفاق کریں۔ مجھے کب اور کن حالات میں یہ لکھنا پڑا تھا کہ ''اب خامہ تلاش کا انتقادی قلم علم سے زیادہ پندار علم کا ڈھنڈورچی ہو گیا تھا'' (ص: ۱۶۲) میرا جملہ لفظ ''اب'' سے شروع ہوا تھا اور یہی لفظ میرے مفہوم کا بنیادی محور ہے۔ خامہ تلاشی کا سلسلہ شروع ہوا، اس کے مثبت نتائج آنے لگے، قلم احتیاط سے پکڑا جانے لگا، خامہ تلاش کی تلاش کسی مجرم کی تلاش نہیں تھی، کھل کر خراج عقیدت پیش کرنے والے اپنے ممدوح سے واقف ہونا چاہتے تھے، ان میں سے کچھ براہ راست استفادہ کرنا چاہتے تھے، سلسلہ آگے بڑھتا گیا، علم اپنی پوری تمکنت کے ساتھ اپنے فیوض لٹاتا رہا، دیگر قارئین کی طرح میں بھی مستفید ہوتا رہا مگر ایک وقت وہ آیا جب میں نے محسوس کیا کہ مداحی نے خامہ تلاش کو رفعت کی سطح مرتفع تک پہنچا دیا ہے، اب آگے بلندی کا کوئی تصور نہیں ہے، اس

احساس کے ساتھ جب میں نے اس سلسلہ کے موقوف ہونے سے پہلے کے چند شمارے پڑھے تو ایسا لگا کہ علم کے متوازی پندار علم کا خط نمایاں ہوگیا ہے جو کبھی کبھی علم پر سبقت لے جاتا ہے۔ میری فہم ناقص میں یہ بات گھر کر گئی اور میں متذکرہ بالا جملہ لکھنے پر مجبور ہوا، یہاں میں بات نہیں بڑھانا چاہتا لیکن اپنی صفائی کا موقع بھی ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہتا۔ اس لیے صرف ایک مثال پر اکتفا کرتا ہوں۔

''پس منظر و پیش منظر''میں مولانا اسید الحق صاحب کا مضمون ''قرآن کریم کی سائنسی تفسیر ایک تنقیدی مطالعہ'' شائع کیا گیا ہے۔ یہ مضمون کی پہلی قسط ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ غالباً یہ مضمون بھی طویل ہے۔ اس کی ساری قسطوں کا مطالعہ کیے بغیر اس مضمون پر کوئی تبصرہ کرنا قبل از وقت ہوگا...... ''مضمون میں ایک جگہ ''قفس'' کو ص سے (قفص) لکھا گیا ہے، غالباً یہ کمپوزنگ کی غلطی ہے یا ممکن ہے کہ مصر میں قفس ''ص'' سے ہی لکھا جاتا ہو ویسے ہماری ناقص معلومات کی حد تک اردو میں قفس ''س'' سے لکھا جاتا ہے۔ (فیروز اللغات)''

مولانا اسید نے اپنے مضمون میں قفس کو ص سے قفص لکھ دیا ہے، اس پر معینی صاحب (یعنی خود اسید صاحب) لکھتے ہیں کہ غالباً یہ کمپوزنگ کی غلطی ہے یا ممکن ہے مصر میں قفس ص سے ہی لکھا جاتا ہو۔ عام قارئین جام نور کو معلوم ہو کہ نہ صرف مصر میں بلکہ دنیائے عرب میں قفس صاد سے ہی لکھا اور بولا جاتا ہے خامہ تلاش نے پچھلے شماروں کی خامہ تلاشی میں کئی جگہ لغات کشوری کا حوالہ دیا ہے، قفس کے تعلق سے لغات کشوری میں مرقوم ہے'' قفس/قفص پرندوں کا پنجرہ یہ لفظ سین اور صاد دونوں سے آیا ہے، مگر اتنا فرق ہے کہ فارسی میں تو سین اور صاد دونوں سے آتا ہے اور عربی میں فقط صاد ہے'' اگر اس اقتباس سے میرے متذکرہ بالا قول کی تائید نہیں ہوتی تو آگے حد ادب!

جیسا کہ پچھلی سطور میں کہا جا چکا ہے کہ خامہ تلاش نے شرر مصباحی کو بھی اپنی نوازشوں سے محروم نہیں رکھا، اس کی قدرے تفصیل یہ ہے:

''بریلی سے مولانا صغیر اختر مصباحی اچانک اپنی تشویش لیے ہوئے نمودار ہوئے ہیں، عالم تصورات میں ہماری ملاقات مولانا سے ہوئی

تو انہوں نے ہماری توجہ محترم شررصاحب کے اس مکتوب کی طرف کرائی جو محترم نے حضرت اشرف میاں کو تحریر فرمایا ہے- مولانا صغیر اختر صاحب نے ہم سے استفسار کیا کہ شرر صاحب نے اس میں ایک جگہ لفظ ''تا ہنوز'' استعمال کیا ہے اس پر آپ کیا کہتے ہیں؟ چوں کہ یہ از قسم استفسار تھا اس لیے ہم نے اس لفظ پر غور کیا اور ہنوز کرر ہے ہیں اور اس وقت تک کرتے رہیں گے جب تک غیاث اللغات کی یہ عبارت ہماری سمجھ میں نہیں آجاتی ''ہنوز بفتح اول وضم نون و وائے معروف بمعنی تا حال وتا اکنوں وکسانے کہ تا ہنوز بزیادت تا گویند غلط است'' (ص:۱۲۸-۱۲۹)

اس کا اعادہ یوں کیا گیا ہے:

''تا ہنوز چونکہ خالص علمی مسئلہ ہے اس لیے تا ہنوز تشنۂ تحقیق ہے'' (ص: ۱۴۰)

اس کا الزامی جواب (جس کا تعلق ''عالم تصورات'' کے افسانے سے ہے) جام نور کے ذریعہ حاضر کیا جا چکا ہے- تحقیقی و تفصیلی جواب کا وعدہ کیا گیا تھا، آج وہ قرض بھی ادا کیا جا تا ہے-

ایک مولانا غیاث الدین رام پوری نے نہیں بلکہ ان کے بعد کئی لغت نویسوں نے بھی تا ہنوز بزیادت تا کو غلط بتایا ہے، لغات کشوری میں ہے ''ہنوز بمعنیٰ تا حال ابھی تک اور تا ہنوز محض غلط'' مرتب نے از راہ دیانت اپنی لغات کی جمع وترتیب میں جن کتابوں سے استفادہ کیا ہے ان میں غیاث اللغات بھی ہے- منیر لکھنوی نے اپنی کتاب ''صحت الفاظ'' میں تا ہنوز کو خواندہ اصحاب کا سہو کہا ہے- یہاں یہ نکتہ قابل توجہ ہے کہ جب بعض کتب لغت میں یہ لفظ مذکور ہے اس کو غلط کہا گیا ہے اس کے صاف معنی یہ ہوئے کہ اس لفظ کا استعمال پڑھے لکھے لوگ کرتے رہے ہیں ورنہ صرف ''ہنوز'' کے معنی بتا دیے جاتے- جو لوگ ''تا'' کو غیر ضروری اضافہ قرار دیتے ہیں یا بے معنی اضافہ کہتے ہیں انہیں منزل گہ پر بھی معترض ہونا چاہیے کہ منزل خود اسم ظرف ہے اس میں ''گاہ'' یا '' گہہ'' کی زیادت چہ معنی دارد؟

کس ندانست کہ منزل گہِ عشاق کجاست
ایں قدر ہست کہ بانگِ جرسے می آید

اسی لغات کشوری میں ''متلاشی'' کے تحت ہے ''پریشان، معدوم، خراب مأخوذ لاشے سے اور بمعنیٰ تلاش کرنے والے کے محض غلط ہے'' یہاں بھی واضح ہے کہ متلاشی کا استعمال خواندہ حضرات کرتے آئے ہیں، اس لیے اس کی طرف متوجہ کرنے کی ضرورت ہوئی مگر کیا متلاشی بمعنی ''تلاش کرنے والا'' کا استعمال رائج نہیں ہے؟ اہل علم میں شائع وذائع نہیں ہے؟ نتیجہ ظاہر کہ جو لفظ جس مفہوم میں اہلِ علم کے مابین شائع وذائع ہوجائے وہ عرفاً صحیح ہے- اس کے علاوہ ہنوز اور تاہنوز میں اطلاق کے اعتبار سے تھوڑا سا فرق معلوم ہوتا ہے مثلاً ہنوز دلی دوراست یہاں ہنوز ہی برمحل ہے لیکن درج ذیل عبارت میں ''وآں رسالہ قبریہ بود بہ سبب آنکہ درقبرش بود تا زمان مامون رشید ہیچ کس را معلوم نشد، دروقت مامون رشید بدست اور سید و بموجب حکم او حنین ابن اسحاق کہ طبیبی است کامل صاحب مذہب از زبان یونانی بہ عربی نقل نمودہ وآں رسالہ مشتمل برفوائد غریبہ ونکات عجیبہ بود تاہنوز دررتیمیش از صدف بیروں نہ آمدہ واز زبان عربی بہ لسان فارسی ترجمہ نشدہ'' ریاض الادویہ- ص: ۱۰۳ مطبوعہ مصطفائی ۱۲۷۲ھ تاہنوز ہی برمحل لگتا ہے- اسی لیے اردو لغات میں اس کے دو معنی لکھے گئے ہیں (۱) ابھی (۲) ابھی تک- اور سو بات کی ایک بات حضرت امیر خسرو کے کلام میں بھی تاہنوز موجود ہے:

خسرو اگر می سوزدت از حامیش رنجہ مشو
بسیار باید تا ہنوز آں شوخ ناداں دررسد

(تحفۃ الصغر، ص: ۱۰۴)

خامہ تلاش کے اعتراض کی بنیاد مولانا غیاث الدین کی ''غیاث اللغات'' ہے، اب ذرا غیاث اللغات اور ملا غیاث کے بارے میں مرزا غالب کے خیالات بھی ملاحظہ ہوں:

(۱) غیاث اللغات ایک نام مؤقر ومعزز جیسے الفربہ خواہ مخواہ مرد آدمی آپ جانتے ہیں یہ کون ہے؟ ایک معلم فرومایہ، رام پور کا رہنے والا، فارسی سے ناآشنائے محض اور صرف ونحو میں ناتمام ''انشائے خلیفہ'' ومنشآت مادھو رام'' کا پڑھانے والا'' (اردوئے معلّیٰ، ص ۵۱۵ حصہ اول، ناشر مجلس ترقی ادب، لاہور)

(۲) ''یہاں تک کہ قتیل نو مسلم لکھنوی اور ملا غیاث الدین ملائے مکتب دار رام پوری اور کوئی روشن علی جونپوری اور کہاں تک کہوں کون کون...... جس کے جی میں آئی متصدی تحریر قواعد انشا ہو گیا'' (اردوئے معلیٰ حصہ دوم، ص ۱۱۳، طبع اول ۱۹۷۰ء، ناشر مجلس ترقی ادب لاہور)

(۳) ''اصل فارسی کو اس کھتری بچے قتیل علیہ ما علیہ نے تباہ کیا، رہا سہا غیاث الدین رام پوری نے کھودیا'' (عود ہندی، ص ۵۶، طبع اول ۱۹۶۷ء، ناشر مجلس ترقی ادب، لاہور)

(۴) ''غیاث الدین رام پور میں ایک ملائے مکتبی تھا ناقل ناعاقل جس کا ماخذ اور مستند علیہ قتیل کا کلام، اس کا فن لغت میں کیا فرجام'' (عود ہندی، ص ۴۰۵، ناشر مجلس ترقی ادب، لاہور)

اختتامیہ:

فاضل گرامی مولانا اسید الحق عثمانی (ابوالفیض معینی) کی تحریریں نہ صرف ہند و پاک میں بلکہ جہاں جہاں تک مؤقر جام نور کی رسائی ہے، بڑی دل چسپی سے پڑھی جاتی ہیں- اس جریدہ کا تفرد یہ ہے کہ نہ صرف اپنی جماعت کے عوام وخواص میں یہ مقبول ہے بلکہ ہر مکتب فکر کے اہل دانش اسے قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اس لیے خامہ تلاشی میں وارد شدہ دولفظوں کے تلفظ و املا کی طرف موصوف کی توجہ منعطف کرانا چاہتا ہوں تا کہ کسی کو انگشت نمائی کا موقع نہ مل سکے-

(الف) ''معنیٰ'' یہ عربی زبان کا لفظ ہے بے شک اس کا تلفظ اور املا معنیٰ الف مقصورہ سے ہے قاعدہ بھی اسی کا متقاضی ہے، فارسی میں اس لفظ کے معنی تو وہی باقی رہے لیکن ہیئت بدل گئی یعنی معنیٰ سے معنی بروزن یعنی ہو گیا (بطور شذوذ ہوتو ہو) اور اردو میں بصورت مفرد یعنی بغیر اضافت بصورت جمع استعمال کیا جانے لگا فصحا کی تحریروں میں یوں لکھا دیکھا جاتا ہے ''اس کے معنی یہ ہیں''- ''عالم کے معنی دنیا کے ہیں'' وغیرہ- شبلی، حالی، مولانا آزاد کی تحریروں میں جابجا دیکھا جاسکتا ہے- غالب کا شعر ہے:

دہر میں نقشِ وفا وجہ تسلی نہ ہوا
ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندۂ معنیٰ نہ ہوا

''اس کا معنیٰ یہ ہے''، ''عالم کا معنیٰ دنیا ہے'' یہ خالص مولوی حضرات بولتے ہیں- معاون الشعرا میں ناسخ کے درج ذیل شعر میں معنیٰ الف مقصورہ سے لکھا ہوا ہے، جو غلط ہے اور اس غلطی پر شعر خود شاہد ہے-

معنیٰ یہ ہیں کہ باغ میں ہم میکشی کریں
جنت میں گر شراب خدا نے حلال کی

ہاں جہاں عربی ترکیب میں واقع ہوگا وہاں عربی کا قاعدہ جاری ہوگا جیسے توجیہ المعنیٰ- صدرالشریعہ نے فاضل بریلوی سے سودا کے اس شعر کا مطلب پوچھا

ہوا جب کفر ثابت ہے یہ تمغائے مسلمانی
نہ ٹوٹے شیخ سے زنار تسبیح سلیمانی

فاضل بریلوی نے جو جواب املا کرایا اس کے دو جملے یہ ہیں (۱) ''شاعر کہ مذہبا سنی نہ تھا اور بدگمانی تمغائے شعرا ہے غالباً اس سے زائد کچھ نہ سمجھا ہوگا اور یہ ایک بیہودہ معنی تھے''-(۲) ''اب معنی واضح ہو گئے کہ جو کفر ثابت ہے وہ تمغائے مسلمان بلکہ جزء ایمان ہے''-
(الملفوظ حصہ اول، ص ۳۱)

نیز:

یہ شہ کی تواضع کا تقاضا ہی نہیں
تصویر کھنچے ان کو گوارا ہی نہیں
معنیٰ ہیں یہ مانی کہ کرم کیا جانے
کھنچنا تو یہاں کسی سے ٹھہرا ہی نہیں

(ب) ''معرکۃ الآرا'' شاید ''معرکہ'' اور ''آرا'' دونوں کو عربی زبان کا لفظ سمجھ کر الف لام سے جوڑ دیا گیا ہے جب کہ ''معرکہ'' عربی اور ''آرا'' فارسی ہے اس کے بارے میں بدایوں کے مولانا ابر احسنی کی ''میری اصلاحیں حصہ دوم'' کی درج ذیل عبارت سے مجھے کلی اتفاق ہے۔

''عربی طریقہ پر ''ال'' اتصالی یا اضافی، ایک فارسی اور ایک عربی لفظ

کے درمیان نہیں آسکتا جیسے معرکۃ الآرا'' اس میں معرکہ عربی ہے ''آرا''
آراستن فارسی مصدر سے سنوارنے کے معنی میں ہے، معنی یہ ہوئے معرکہ کو
سنوارنے والا یہ ترکیب غلط ہے۔''معرکہ آرا'' ہونا چاہیے''۔(ص:۹۵)

(ماہنامہ جام نور، مارچ ۲۰۱۱ء)

ایک ''تجزیۂ شعر'' کا جائزہ

مری ہستی فضائے حیرت آبادِ تمنا ہے
جسے کہتے ہیں نالہ وہ اسی عالم کا عنقا ہے

یہ شعر غالب کے ان اشعار میں سے ہے جو اپنے شستہ الفاظ اور چست بندشوں کے سبب بڑے سامعہ نواز ہوتے ہیں۔ ہندوستان میں غالب کو یہ شرف حاصل ہے کہ جب کھینچ تان کر اس کے اشعار کے معانی بیان کیے جاتے ہیں تو اسے اپنے ذہن رسا کا کمال سمجھا جاتا ہے اور جب ہزار دماغ سوزی کے باوجود مطلب سمجھ میں نہیں آتا تو شعر کا رتبہ اور بلند ہو جاتا ہے۔ یہی عزت پاکستان میں علامہ اقبال کے حصے میں آئی ہے نہ یہاں غالب کا کوئی نظیر، نہ وہاں اقبال کا کوئی مثیل دونوں ملک ایک ایک شاعر کو لئے بیٹھے ہیں۔

ایوان غالب دہلی کی طرف سے ماہانہ نشست [1] کا انعقاد ہوتا ہے جس میں غالب کے کسی شعر کو منتخب کر کے اس کی تشریح کے لئے کسی معروف دانشور کو دعوت مقالہ نگاری دی جاتی ہے اور مقالہ خوانی کے بعد چند مخصوص و متعین علمائے ادب کو اس شعر اور مقالہ کے مندرجات پر اظہار خیال کا موقع دیا جاتا ہے۔ اب تک غالب کے جس جس شعر پر اظہار خیال کی نوبت آئی ہے کسی ایک کا مفہوم متعین نہیں کیا جا سکا اور ایوان غالب سے ہر شخص عالم تحیر میں واپس ہوا ہے۔

۲۸ / جولائی ۱۹۸۴ء کی نشست میں غالب کا مذکورہ بالا شعر عنوان سخن تھا جس کی تفصیل مجھے نہیں معلوم البتہ محترم پروفیسر عنوان چشتی نے ۶ / اگست کے ''قومی آواز دہلی'' میں ''غالب کے ایک شعر کا تجزیہ'' کے عنوان سے اس شعر پر اپنا زور قلم صرف کیا ہے جس پر یہاں اظہار خیال مقصود ہے۔

درحقیقت اس شعر کو سمجھنے کے لیے فلسفۂ وجود و وحدۃ الوجود کے سلسلے میں غالب کے

---

(۱) یہ سلسلہ مئی ۱۹۸۴ء سے شروع ہوا۔ شرر

افکار و نظریات کا جاننا ناگزیر ہے۔ اور ساتھ ہی ساتھ ان الفاظ کی مزاج آشنائی بھی جو غالب کے متصوفانہ کلام میں ایک خاص آہنگ کے ساتھ استعمال کیے گئے ہیں، اس سلسلے میں بہت سے اشعار پیش کئے جا سکتے ہیں جو غالب کے نظریۂ وحدۃ الوجود یا فلسفۂ نیستی کو واضح کرتے ہیں لیکن غالب نے فارسی کے ایک شعر میں اس باب میں اپنے نظریے کو دو ٹوک انداز میں بیان کر دیا ہے۔

غالب ز گرفتاری اوہام بروں آ

باللہ جہاں ہیچ و بد و نیک جہاں ہیچ

اس سے واضح ہے کہ غالب ہستی کو نہ صرف ہستی ناپائیدار بلکہ اسے مرتبۂ عدم میں سمجھتا تھا۔ چناں چہ شعر رأس البیان میں بھی غالب نے چند ایسے الفاظ انتخاب کئے ہیں جو اپنی کیفیت یا مآل کے لحاظ سے عدمی صفات کے حامل ہیں گو بظاہر ان کی وجودی حیثیت ہے جیسے کہا جائے کہ میرے ہاتھ میں صفر ہے تو اگرچہ بظاہر یہ قضیۂ موجبہ ہے لیکن اس کا مفہوم سراسر عدمی ہے یعنی میرے ہاتھ میں کچھ نہیں ہے۔ بالکل اسی طریق پر میری ہستی مبتدا یا محکوم علیہ کے لئے جو وجودی ہے فضا کو اپنے تمام مشمولات کے ساتھ خبر یا محکوم بہ بنایا گیا ہے جس میں فضا ایک بعد موہوم ہے، حیرت ایک کیفیت مشوش ہے تمنا کے اجزائے معانی میں بیشتر حصے ناممکنات کے ہیں اس طرح ''فضائے حیرت آباد تمنا'' پورے جملہ ناقصہ کا مفہوم عدمی ہے۔ اسی طرح نالہ ایک وجودی شے ہے (گو منفی کیفیت کا حامل ہے مگر عدمی نہیں ہے) جس کو اسی عالم عدمیات (فضائے حیرت آباد) کا عنقا کہا گیا ہے، یہاں عنقا خود وجودی لفظ ہے جس کا مفہوم عدمی ہے۔

اہل علم کے نزدیک عنقاء ایک معلوم الاسم، مجہول الجسم پرندہ ہے۔ اب چند لفظوں میں شعر کا مفہوم سمٹ کر اتنا سا رہ گیا ہے:

میری ہستی تمناؤں سے پیدا شدہ تحیرات کی موہوم فضا کے سوا کچھ بھی نہیں ہے اور جسے

نالہ کہتے ہیں، اس کا حال بھی اس سے دگرگوں نہیں ہے۔

میں نے قصداً دونوں مصاریع کے مفہوم کی وضاحت کے لئے قضایائے سالبہ استعمال کئے ہیں تا کہ یہ امر مبرہن ہوسکے کہ غالب نے جن الفاظ کو ظاہراً وجودی صفت کے ساتھ استعمال کیا ہے وہ مفہوماً عدمی ہیں۔

غالب نے اس شعر میں ہستی اور نالہ کو بنیاد بنایا ہے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوسکتا ہے کہ ہستی کے ساتھ غالب کے ذہن میں نالہ کا تصور کیوں کر ابھرا جب کہ ہستی کے ظواہر اور بہت سے ہیں مثلاً عیش وعشرت، ہمہمہ وطنطنہ، رندی وسرمستی وغیرہ۔شاید اس لئے کہ جب ہستی کی کنہ سے اس کی ساری مثبت اور ایجابی صفات سلب کر لی گئیں تو منفیات کے سوا بچا ہی کیا اور منفیات میں نالہ سے زیادہ حقیقی اور مرکزی مفہوم کا حامل اور کون سا لفظ ہے لیکن پھر وہ نالہ کے وجود کا بھی منکر ہے کیوں کہ جب ہستی ہی کی اپنی کوئی حقیقت نہیں ٹھہری جس کا ایک جز نالہ بھی ہے تو اس کے مستلزمات کے وجود کی کیا حیثیت جیسا کہ اس شعر سے واضح ہے ۔

غالب ز گرفتاری اوہام بروں آ
باللہ جہاں ہیچ و بد و نیک جہاں ہیچ

اس شعر میں بھی پہلے ہستی کو ہیچ (سراسر عدم) کہا پھر اس کے مثبت ومنفی ہر دو پہلو کو معدوم قرار دیا۔

محترم عنوان چشتی صاحب نے تمنا کو غالب کا محبوب لفظ بتایا ہے جس کے احاطہ میں ذوق،شوق، آرزو، جستجو، تلاش وطلب اور درد و داغ کی کیفیتیں آتی ہیں اور شعر زیر بحث کو ان ساری کیفیات کا حامل بتایا ہے، اس باب میں میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہنا چاہتا کہ لفظ تمنا کو واضع نے جس مفہوم اور کیفیت کے لئے وضع کیا ہے، نہ غالب نے اس سے سرموانحراف کیا ہے، نہ غالب کے پیش روشعرا اس لفظ کو بھرپور معنی پہنانے سے قاصر رہے ہیں۔

خوب صورت اور فریب نظر الفاظ کے استعمال کی دوڑ میں اپنی شکست کا اعتراف کرتے ہوئے عرض گزار ہوں کہ تمنا کے معنی صرف آرزو کے ہیں اور آرزو کے مفہوم کے جتنے اجزا

ہو سکتے ہیں یا اس کا مفہوم جس قدر وسیع ہو سکتا ہے اس میں اتنی کیفیات شامل ہیں جن میں سے بعض کا ذکر چشتی صاحب کر سکے ہیں، میرزا مظہر جانجاناں نے شوق اور آرزو کو بنیاد بنا کر ایک شعر کہا ہے جس کی وسعت اور جذب و تاثیر کو غالب کا شاید کوئی شعر چیلنج نہیں کر سکتا۔

شمار شوق ندانستہ ام کہ تا چند ست
جزیں قدر کہ دلم سخت آرزومند ست

چشتی صاحب نے لفظ عنقا کو اس شعر میں پہیلی قرار دیا ہے، تاہم جب وہ شعر کی تشریح کرتے ہیں تو یہ لفظ کہیں سے بھی پہیلی نہیں رہ جاتا بلکہ وہ ایک متعین مفہوم کا حامل نظر آتا ہے۔ البتہ انھوں نے عنقا کے لغوی معنی تحریر کرنے میں دقت نظر سے کام نہیں لیا، عبارت ملاحظہ ہو:

''عنقا کے لغوی معنی لمبی گردن والے، سی مرغ، ناپید یا معدوم اور عجیب و غریب کے ہیں''۔

عرض تحریر یہ ہے کہ دراز گردن کے معنی میں یہ لفظ خالص عربی ہے جو اعنق کا مونث ہے اس کا املا عنقاء ہمزۂ آخر سے ہے۔ اس لیے لمبی گردن والے کی جگہ لمبی گردن والی لکھنا چاہیے تھا کیوں کہ یہ لفظ کسی مذکر کی صفت نہیں بن سکتا اس کے لئے اعنق ہے البتہ اہل فرس عنقا بمعنی پرندۂ معروف الاسم و مجہول الجسم کو (مفرس کر کے) بغیر ہمزہ استعمال کرتے ہیں۔ اگرچہ عنقا کے سلسلے میں کتب لغت و تاریخ میں انتہائی مبالغہ سے کام لیا گیا ہے تاہم لسان العرب وغیرہ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حنظلہ بن صفوان کے وقت میں کوہ دمخ پر یہ پرندہ نظر آیا تھا لیکن حسب عبارت لسان العرب ''لم یبق فی ایدی الناس من صفتھا غیرا سمھا'' یعنی عنقاء ایک ایسا پرندہ ہے جس کے نام کے سوا اب کچھ بھی باقی نہیں رہا۔ اسی لئے اہل فرس نے اس کا استعمال بطور کنایہ ناپید اور معدوم کے معنی میں کیا ہے (عربی میں یہ معنی نہیں ہیں) لیکن عنقا کا عجیب و غریب کے معنی میں ہونا عجیب و غریب ہے کتب لغت میں ممکن ہے یہ معنی مل جائیں لیکن لغت کی صحت کا پیمانہ قدما کا کلام ہے، غالب نے عنقا کا استعمال طائر مجہول الصفۃ اور ناپید و معدوم کے سوا اور کسی معنی میں نہیں کیا ہے۔ چند اشعار

ز دست رفتۂ عنانم بعالمے کہ دراں
بہ رشتہ ریش کند طفل پائے عنقا را

راستی از رقم صفحۂ ہستی خوانند
نقش کج بر ورق شہپر عنقا بینند

اندیشہ دو صد گل کدہ بردہ بدامن
اما ہمہ از نقش و نگار پر عنقا

گردم ہلاک فرۂ فرجام رہروے
کاندر تلاشِ منزل عنقا شود ہلاک

آگہی دام شنیدن جس قدر چاہے بچھائے
مدعا عنقا ہے اپنے عالم تقریر کا

دراصل عنقا کا ماخذ عنق ہے اور عنقاء کی وجہ تسمیہ صاحب لسان نے یہ بتائی ہے کہ اس کی گردن میں مخصوص قسم کی سفیدی طوق کی طرح ہوتی ہے۔ اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ عنقا کا استعمال عجیب وغریب کے معنی میں ہوتا ہے تو یہ اس کے معنی حقیقی نہیں ہوں گے بلکہ یہ استعمال صریحاً مجازاً ہوگا اور اس کی بنیاد وہ افسانے ہوں گے جو عنقا کے سلسلے میں کتب لغت و تاریخ میں مذکور ہیں جن کی روشنی میں عنقا ایک عجیب وغریب پرندہ قرار دیا جاتا ہے۔

چشتی صاحب کا یہ قول کہ:

"شعر زیر بحث میں غالب نے عنقا معدوم کے معنی میں نہیں
بلکہ معنی بعید یعنی عجیب وغریب کے معنی میں برتا ہے"

میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ یہاں معنی بعید سے آں موصوف کی مراد کیا ہے اگر ان کی مراد یہ ہے کہ چوں کہ عنقا کے بیانِ معنی میں لمبی گردن والے سے لے کر عجیب وغریب تک میں عجیب وغریب چوتھے نمبر پر ہے اس لئے شمار میں یہ معنی بعید قرار پایا تو یہ عجیب وغریب منطق ہے اور اگر معنی بعید سے ان کی مراد ایہام وتوریہ ہے جو ارباب معانی و بیان کے نزدیک ایک

صنعت کا نام ہے تو یہ اور مضحک بات ہوگی۔اسی طرح چشتی صاحب نے شعر زیر بحث میں عالم کے سلسلے میں لکھا ہے کہ

''غالب نے یہاں عالم کا لفظ استعمال کیا ہے جس کے معنی دنیا اور کیفیت کے ہیں یہاں معنی بعید (کیفیت) مراد ہیں''۔

میری عرض یہ ہے کہ عربی میں عالم کے معنی دنیا کے ہیں فارسی اور اردو میں حالت وکیفیت کے معنی میں بھی اس کا استعمال ہونے لگا ہے تو عالم بمعنی حالت وکیفیت معنی بعید کیوں کر ہوگیا؟

اگر تھوڑی دیر کے لیے یہ فرض کرلیا جائے کہ اس شعر میں عالم کے معنی کیفیت اور عنقا کے معنی عجیب وغریب کے ہیں تو پھر دوسرے مصرع میں الفاظ کی ترتیب یوں ہونی چاہیے تھی ''جسے کہتے ہیں نالہ اس کا عالم (اس کی کیفیت) عنقا (عجیب وغریب) ہے۔

عروضی نقطۂ نظر سے:

چشتی صاحب شعر زیر بحث کے تحت عروضی بحث چھیڑتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''یہ شعر بحر ہزج مثمن سالم میں ہے جس کے ارکان یہ ہیں

مفاعی لن مفاعی لن مفاعی لن مفاعی لن

یہ بہت مترنم بحر ہے...... اگر عروض کے اصولوں کی روشنی میں اس کی مزاحف شکلیں وضع کی جائیں تو کئی سو نئے اوزان حاصل ہوسکتے ہیں''۔

یہ دعویٰ اتنا ہی صحیح ہے جتنا صاحب مخزن العروض کا یہ دعویٰ کہ رباعی کے دس ہزار اوزان نکل سکتے ہیں اور صاحب میزان الافکار شرح معیار الاشعار کا یہ دعویٰ کہ رباعی کے بیاسی ہزار نوسو چوراسی اوزان نکلتے ہیں۔

چشتی صاحب مجھے بتائیں کہ جن مزاحف اوزان کا اب تک استخراج نہیں کیا گیا ہے انھیں بالفعل نظر انداز کیجیے اب تک بحر ہزج کی جتنی مزاحف اشکال وضع کی جاچکی ہیں کیا وہ بھی بحر ہزج سالم کی طرح مترنم ہیں؟ لیجیے بہت پہلے سے مستخرج ہوئے چند اوزان تحریر کررہا ہوں

ان میں سے کسی وزن پر اردو کی کوئی غزل نظیر میں پیش کر دیجیے

مفاعیل مفاعیل مفاعیل فعولن

مفاعیل مفاعیل مفاعیل فعلن

مفاعیل مفاعیلن مفعولن فعلن

مفاعیلن مفاعیلن مفعول فعولن

مفاعیلن مفعول مفاعیل فعولن

مفاعیلن مفعول مفاعیلن فعلن

چشتی صاحب آگے تحریر فرماتے ہیں:

''ان میں سے بعض اردو میں رائج ہیں خود غالب نے اس بحر کے کئی مزاحف اوزان میں غزلیں لکھی ہیں مثلاً

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا
درد کی دوا پائی دردِ لا دوا پایا

جو بحر ہزج مثمن اشتر مکفوف مقبوض مخنق سالم میں ہے اور اس کا وزن فاعلن مفاعی لن فاعلن مفاعی لن ہے۔ اس طرح حسب ذیل اوزان اردو میں بہت مقبول ہیں

ا:- بحر ہزج مثمن مقبوض جمیع الاجزاء

(وزن)

مفاعلن مفاعلن مفاعلن مفاعلن

۲:-

بحر ہزج مثمن اخرب مکفوف مکفوف محذوف

مفعول مفعول مفاعیل فعولن''

چشتی صاحب نے مزاحف اوزان میں سے صرف دو اوزان کو بہت مقبول بتایا ہے، لیجیے ہم ان دو مقبول اوزان پر ایسے ہی مقبول تین اوزان کا اضافہ کیے دیتے ہیں جن سے اردو اساتذہ کا کلام بھرا پڑا ہے۔

۳:- بحر ہزج مثمن-اخرب-مکفوف، مکفوف مخنق سالم

(وزن) مفعول مفاعی لن مفعول مفاعی لن

۴:- بحر ہزج مسدس سالم محذوف الآخر

(وزن) مفعول مفاعی لن مفعول فعولن

۵:- بحر ہزج مسدس مقبوض جمیع الاجزاء

(وزن) مفاعلن مفاعلن مفاعلن

چشتی صاحب کا یہ دعویٰ ہے کہ یہ بحر رومانی اور جذباتی وفور کے اظہار کے لئے اتنی ہی ناگزیر ہے جتنی سنجیدہ افکار اور نادر تجربات کے اظہار کے لیے۔ یہ دعویٰ مبنی بر حقیقت نہیں ہے کیوں کہ اگر دیوان غالب فارسی و اردو کی کل غزلوں کی بحروں کا تفحص کیا جائے تو شاید تین فیصد بھی غزلیں بحر ہزج سالم میں نہیں ملیں گی حالاں کہ جن کیفیات کے اظہار کے لئے چشتی صاحب نے اس بحر کو ناگزیر بتایا ہے، یہ ساری کیفیات غالب کی کل غزلوں کے تقریباً 95% اشعار کا احاطہ کرتی ہیں۔

مقدمۂ قصیدتان رائعتان پر ایک نظر

یہ تحریر عالم ربانی مولانا اسید الحق قادری کی خواہش کی تکمیل کی کوشش ہے، جس کا اظہار موصوف نے بغداد معلیٰ کی حاضری سے پہلے فون پر، ایس ایم ایس کے ذریعے اور خواجہ بک ڈپو، دہلی کے پروپرائٹر مولانا غلام حسن کے توسط سے کیا تھا۔

فضیلۃ الشیخ علامہ اسید بدایونی علیہ الرحمۃ ہمارے درمیان نہ رہے، مذہبی، علمی اور شعری وفنی دنیا ایک عظیم سپوت سے محروم ہوگئی، مرحوم نے چالیس برس سے کم عمر میں قوم وملت کے لیے جو جواہر پارے چھوڑے ہیں اس سے یہ اندازہ کرنا کچھ دشوار نہیں کہ اس بطل جلیل کی طبع رواں چالیس کی عمر پار کر کے معمورۂ علم وفن کو کیسے کیسے گلہائے رنگ رنگ سے آباد کرتی۔

خوش درخشید ولے دولت مستعجل بود

میں حیران ہوں، بغداد معلیٰ کی حاضری میں یہ حادثہ پیش آیا، وہی سرکار غوثیت جس کے بارے میں سیدی امام احمد رضا فرماتے ہیں:

عطفاً عطفاً عطوف عبدالقادر
رأفاً رأفاً رؤف عبدالقادر
اے آنکہ بدست تست تصریف امور
اصرف عنا الصروف عبدالقادر

یہ سب کچھ محو واثبات پر تصرف کرنے والے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کے نور نظر کے سامنے ہوا، دہشت گرد اپنے منصوبے میں کامیاب رہے، یہ خدائی بھید ہے، ہماری فہم سے ورا ہے، بہت ننھا کاتنے سے دماغ پھٹ جائے گا، کیا معلوم شیخ بدایونی نے بارگاہ غوثیت میں کیا استغاثہ کیا تھا۔

شیخ بدایونی کی رحلت نہ صرف خانوادۂ عثمانی بدایوں شریف کے لیے بلکہ پوری دنیائے علم وحکمت کے لیے ایک عظیم المیہ ہے اور اس پر جتنا رنج وغم کا اظہار کیا جائے کم ہے لیکن

قدرت نے اس زخم کے لیے ایک ایسا مرہم شفا بھی عطا کر دیا ہے جو ہر زہر غم کا تریاق ہے۔ جہاں رحلت، وفات اور انتقال کے تصور نے ہمیں نڈھال کر دیا ہے، وہیں شہادت کے لیے وعدۂ الٰہیہ کا خوشگوار تصور تسکین قلب کا سامان فراہم کر رہا ہے۔ شہادت ایک ایسا راستہ ہے جو کہیں سے کج مج نہیں ہے، سیدھا جنت الفردوس کو جاتا ہے، پھر سرکار غوثیت کے احاطے میں مدفون ہونے کا شرف نورٌ علیٰ نور:

این دولت سرمد ہمہ کس را ندہند

فاضل بدایونی نے چند ماہ پیشتر مجھ سے فون پر کہا تھا کہ انھوں نے سیدنا اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے دو قصیدے مدائح فضل الرسول اور حمائد فضل الرسول کا تحقیقی جائزہ لیا ہے، اسے ایک نظر دیکھ لیجیے تاکہ طباعت کا عمل شروع کیا جائے، چند روز کے بعد خواجہ بکڈ پو سے مسودہ کا پرنٹ آؤٹ مجھے ملا اور یہ پیغام بھی کہ اس کی طباعت آپ کے دیکھ لینے کے بعد ہی ہوگی، میں اپنی سرکاری اور غیر سرکاری مصروفیات کی وجہ سے مواد کا مطالعہ نہ کر سکا، تاہم فون کے ذریعے خیالات کا تبادلہ ہوتا رہا، میری تأثراتی تحریر بروقت نہ پہنچ سکی، وقتاً فوقتاً ٹیلی فونی رابطہ کو غنیمت سمجھ لیا گیا اور تحقیقی جائزہ مترجم قصائد کے ساتھ شائع ہو گیا۔

امام احمد رضا کے دونوں قصائد جو حضرت سیف اللہ المسلول مولانا شیخ فضل رسول رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی مدح میں کہے گئے ہیں، قصائد کے نام ''مدائح فضل الرسول'' اور ''حمائد فضل الرسول'' حضرت امام کے رکھے ہوئے ہیں، جن سے ۱۳۰۰ھ برآمد ہوتا ہے لیکن دونوں قصائد کے مجموعے کا نام ''قصیدتان رائعتان'' حضرت امام کا رکھا ہوا نہیں ہے، قیاس کہتا ہے کہ اگر وہ اس مجموعے کا نام رکھتے تو اس سے بھی تاریخ نظم برآمد ہوتی، تاہم یہ نام بہت اچھا تجویز ہوا ہے۔ تجویز کنندہ کسے باشد۔ سب سے پہلے میں حضرت امام احمد رضا رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی بارگاہ میں نذرانۂ عقیدت پیش کرتا ہوں کہ آپ نے دونوں قصائد کے لیے جس بحر کا انتخاب کیا ہے یہ تازی الاصل ہے، اہل فارس اور اہل ہند کے طبائع سے اس کے زحافی اوزان کی موزونیت میل نہیں کھاتی، مگر عرب شعرا کا کلام اس بحر کے اسی زحافی وزن میں سب سے زیادہ دیکھا گیا ہے۔

پہلا قصیدہ جو بحر کامل میں ہے اس کے تعلق سے فاضل بدایونی رقم طراز ہیں:

''بحر کامل میں چھ تفعیلات ہوتے ہیں- تین پہلے شطر میں اور تین دوسرے شطر میں اس کا پورا وزن یوں ہے:

مُتَفَاعِلُن مُتَفَاعِلُن مُتَفَاعِلُن

مُتَفَاعِلُن مُتَفَاعِلُن مُتَفَاعِلُن

پہلے شطر کا آخری تفعیلہ عروض کہلاتا ہے اور دوسرے شطر کا آخری تفعیلہ ضرب کہلاتا ہے۔''

اسی کے ساتھ فاضل راقم نے ایک نکتہ کی طرف توجہ دلائی ہے کہ

''بحر رجز اور بحر کامل میں نہایت باریک فرق ہے کیونکہ بحر رجز میں مندرجہ ذیل چھ تفعیلات ہوتے ہیں:

مستفعلن مستفعلن مستفعلن

مستفعلن مستفعلن مستفعلن''

اس باریک فرق کی وضاحت یہ ہے کہ بحر کامل کے رکن متفاعلن کا حرف ثانی ساکن ہوجانے کی صورت میں مُتَفَاعِلُن ، مُتْفَاعِلُن ہوجاتا ہے، جسے اہل عروض، معروف عروضی وزن مستفعلن سے بدل دیتے ہیں- یہ زحافی صورت جس کا اصطلاحی نام ''زحاف اضمار'' ہے، بحر کامل میں عام ہے، اس بحر میں اگر کوئی تفعیلہ مستفعلن پر تقطیع ہو تو نہ صرف جائز ہے بلکہ دیگر زحافات کے بالمقابل مستحسن ہے، لیکن بحر رجز کے جو تفعیلات ہیں ان میں سے کوئی تفعیلہ متفاعلن پر تقطیع نہیں ہوگا-

فاضل بریلوی کا قصیدہ نونیہ بحر کامل میں ہے، اس کی ضرب میں ایک اور زحاف کو راہ ملی ہے جو اہل عرب میں نہایت مطبوع ہے لیکن فارسی اور اردو میں یہ زحافی شکل غیر مطبوع ہے۔ عروض کی کتابوں میں جو اشعار لکھے گئے ہیں وہ محض تفہیم کے لیے ہیں، کوئی باضابطہ قصیدہ راقم الحروف کی نظر سے نہیں گزرا ہے- فاضل بدایونی نے اس قصیدہ کا اصل وزن واضح کرتے ہوئے بطور مثال ایک شعر کی تقطیع کی ہے، کیونکہ پورا قصیدہ (باستثنائے چند دیگر زحافات) اسی وزن پر تقطیع ہوتا ہے-

تبکی دمن و تقول فی اسجاعها

مُتْفَاعِلن متَفاعلن مُتْفَاعِلن

اللہ یض حک سن من ابکانی

مُتْفَاعِلن متَفَاعِلن مُتْفَاعِل

جائزہ نگار نے واضح کر دیا ہے کہ پہلے شعر کی ضرب میں (یعنی ''رن الحمام الخ'' میں) زحاف اضمار و قطع واقع ہے، یہ تفہیماً ہے لیکن اگر عروضیوں کے تعامل کے پیش نظر اضمار کی صورت میں مُتْفَاعلن کو مستفعلن اور مُتْفَاعَل کو مفعولن لکھا جاتا تو درست ہوتا۔

جیسا کہ عرض کیا گیا بحر کامل سالم میں زحاف اضمار عرب شعرا میں عام ہے اور ان کے طبائع کہیں سے بھی اس کی موزونیت میں کھٹک محسوس نہیں کرتے لیکن فارسی اور اردو شعرا کے طبائع میں اس کی موزونیت غنائیت کو کسی حد تک متاثر ضرور کرتی ہے، مثلاً یہ شعر:

نہ ہوئی کبھی مجھ سے خطا نہ ہوا کرو مجھ پر خفا

نہ دیا کرو تم گالیاں نہ کیا کرو مجھ پر جفا

پہلا مصرعہ متفاعلن مستفعلن متفاعلن مستفعلن پر اور دوسرا مصرع بھی متفاعلن مستفعلن متفاعلن مستفعلن پر تقطیع ہوتا ہے جو کسی طرح بھی غلط نہیں ہے، لیکن غور کیجیے تو ایسا لگتا ہے کہ ایک نبض تواتر کے ساتھ چلتے چلتے دو مقامات پر سکون کا وقفہ قدرے بڑھا کر آگے بڑھ رہی ہے، طبائع اور مزاج کے اسی اختلاف کی وجہ سے عربی بحور کے بہت سے مزاحف اوزان، فارسی اور اردو میں مستعمل نہیں ہیں۔ بحر کامل کا یہ قصیدہ نونیہ اپنے زحاف اضمار و قطع کی وجہ سے فارسی اور اردو میں غیر مطبوع ہے اور عربی میں شائع و ذائع ہے ۔جیسا کہ سطور بالا میں ''باستثنائے چند'' سے اشارہ کیا گیا، قصیدے کی ہر ضرب مُتْفَاعل (مفعولن) پر قطع نہیں ہوتی بلکہ بہت سی ضربیں فَعِلَاتُنْ کے وزن پر ہیں بلکہ رکن مُتَفَاعِلُنْ میں جب زحاف قطع آتا ہے تو وہ اصلاً فَعِلَاتُنْ ہی ہوتا ہے، کیوں کہ رکن کے آخر سے وتد مجموع کے ایک حرف متحرک کو ساقط کرنے سے یہ زحاف پیدا ہوتا ہے۔ یہاں متفاعلن کے عِلُن کا

عین متحرک ساقط کرنے سے مُتَفَاْلُن کی شکل بنی، جسے فَعِلَاتُنْ سے تبدیل کیا گیا-اب اس مقطوع کو جب مضمر بنایا گیا، یعنی دوسرے متحرک حرف کو ساکن کیا گیا تو فَعْلَاتُن ہوا جس کی تبدیل شدہ شکل مفعولن ہے-اب اگر پورا قصیدۂ نونیہ ملاحظہ کیا جائے تو ہر شعر کی ضرب یا تو فَعِلَاتُنْ سے تقطیع ہوگی یا مفعولن سے اور یہ زحافات قصائد عرب میں شائع وذائع ہیں-

جیسا کہ عرض کیا گیا تازیوں کے یہاں بحر کامل مسدس ہے لیکن فارسی اور اردو میں اہل عروض نے اسے مثمن بھی بنالیا ہے اور زحاف اضمار ہر ایک کے یہاں جائز ہے- قصائد عرب میں تو مجھے ایک قصیدہ بھی ایسا نظر نہیں آیا جس میں زحاف اضمار نہ پایا جاتا ہو- مثال کے طور پر متنبی کا مطلع ہی بحر کامل مضمر سے شروع ہوتا ہے:

یا لائمی کف الملام عن الذی
اضناہ طول سقامہ و شقائہ

اس کے بعد کے ہر دو تین شعر کے بعد زحاف مضمر نظر آتا ہے-اس ضمن میں مَیں فاضل بریلوی کے کمال فن کو ہدیۂ عقیدت پیش کرتا ہوں کہ جہاں عربی دواوین میں بحر کامل کا کوئی قصیدہ اس زحاف سے خالی نہیں ہے، وہیں اعلی حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے دو نعتیہ کلام جو حدائق بخشش حصہ اول و دوم میں ہیں ان میں سے ایک نعت شریف ۱۶/اشعار پر اور دوسری ۲۷/اشعار پر مشتمل ہے- دونوں بحر کامل سالم مثمن میں ہیں اور ۴۳/اشعار میں سے ایک مصرع میں بھی زحاف اضمار واقع نہیں ہوا ہے- ان میں سے ایک نعت کا مطلع ہے:

وہ کمال حسن حضور ہے کہ گمان نقص جہاں نہیں
یہی پھول خار سے دور ہے یہی شمع ہے کہ دھواں نہیں

اور دوسری نعت کا مطلع ہے:

نظر اک چمن سے دو چار ہے نہ چمن چمن بھی نثار ہے
عجب اس کے گل کی بہار ہے کہ بہار بلبل زار ہے

بحر کامل سالم مثمن کی دونوں نعتوں میں سارے الفاظ پورے تواتر کے ساتھ آگے کی طرف رواں دواں ہیں۔

فاضل بدایونی کے تحقیقی جائزے کا وہ حصہ نہایت وقیع ہے جس میں زیر نظر قصائد پر نحو ولغت یا عروض وقوافی کی جہت سے فاضل بغداد ڈاکٹر رشید عبیدی کی بعض تنقیدات کا جواب دیا گیا ہے۔

فاضل بدایونی نے فاضل بغدادی کے تعارف میں لکھا ہے کہ موصوف نے جامعہ بغداد سے بی اے، جامعہ القاہرہ ازہر سے ایم فل اور وہیں سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی ہے اور فنون ادبیہ کی مختلف شاخوں پر کم وبیش ۵۰۰ر تحقیقی مقالات اور مضامین قلم بند کیے۔ تین شعری دیوان اپنی یادگار چھوڑے، یہ اپنی جگہ ،لیکن فاضل بغدادی کی تنقیدات اور فاضل بدایونی کے جوابات کو دیکھتے ہوئے قارئین کو یہ فیصلہ کرنے میں تأمل نہیں ہوگا کہ میدان علم وتحقیق کا معرکہ سر کرنے والا کوئی اور نہیں بلکہ خانوادۂ عثمانی بدایوں شریف کے علوم ومعارف کی آغوش کا پروردہ ہے جسے فضیلۃ الشیخ اسید بدایونی کہتے ہیں۔

۲۰۱۴ء

یہاں طول کلام سے بچتے ہوئے ایک مثال پر اکتفا کرتا ہوں۔

ڈاکٹر عبیدی سے ایک عجیب فنی وعروضی مغالطہ ہوا، انھوں نے درج ذیل شعر میں العینان کو عین کا تثنیہ قرار دیا:

تسقی فتشفی ثم تشقی بالعنا
و تفلق الاکباد والعَیَنان

ڈاکٹر عبیدی نے عینان کو تثنیہ قرار دینے کے باوجود لہجات عرب کا سہارا لیتے ہوئے اور فاضل بریلوی رحمۃ اللہ تعالی علیہ سے حسن ظن قائم رکھتے ہوئے دفع دخل مقدر کیا ہے۔ تاویل بعید کی ضرورت یوں ہوئی کہ اَلعَیَنان حالت جری میں ہے، الف کے ساتھ لکھنا خلاف قاعدہ ہے۔ فاضل بدایونی نے اس پر حیرت کا اظہار کیا ہے کہ جب خود فاضل بریلوی نے العینان کی یا پر زبر لگایا ہے تو پھر اس کو عین کا تثنیہ قرار دینے کی طرف ناقد کی توجہ منعطف ہونی ہی نہیں چاہیے تھی۔ اس کے بعد العینان کی لغوی تحقیق کر کے اور خود مصنف قصیدہ کی مرقومہ عبارت نقل

کر کے، مسئلہ بے غبار کر دیا ہے- یہاں میں ایک نکتے کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں کہ ڈاکٹر عبیدی جیسے عالم و فاضل اور زبان ولغت پر گہری نظر رکھنے والے کو یہ دھوکا کیسے ہوا اور مصنف قصیدہ نے جو العینان کی ی پر زبر لگایا ہے اس کے باوجود انھوں نے العینان کو ساکن کیوں پڑھا؟ ڈاکٹر عبیدی کی علمی استعداد کو نگاہ میں رکھتے ہوئے یہ سوال از خود قائم ہوتا ہے- میرے خیال میں مصنف قصیدہ کا حاشیہ یا بین السطور ڈاکٹر صاحب کے پیش نظر تھا، ان کی نظر عینان کے زبر پر بھی پڑی ہوگی، مگر وہ اس غلط فہمی کا شکار ہو گئے کہ شاید یہ زبر سہو کاتب ہے، اس غلط فہمی کی بنیاد یہ ہو سکتی ہے کہ زیر نظر شعر میں العینان میں ع ی ن تینوں متحرک واقع ہوئے ہیں، جب کہ اس قصیدے کے آگے پیچھے کے اشعار میں تینوں متحرک نہیں ہیں- بہ الفاظ دیگر، دیگر اشعار کی ضرب مفعولن سے تقطیع ہو رہی ہے- العینان کی ی اس تقطیع میں فٹ نہیں ہو رہی ہے- غالباً اسی تصور نے ڈاکٹر عبیدی کو اسے صیغہ تثنیہ قرار دینے پر مجبور کیا- پھر بھی انھوں نے حسن ظن قائم رکھا اور لہجات عرب کے سہارے مصرع کو غیر موزوں قرار دینے سے احتراز کیا-

میں نے پچھلی سطور میں اسی نکتے کی طرف اشارہ کیا ہے کہ اس قصیدے کی ضرب میں مفعولن اور فعلاتن دونوں زحافوں سے کام لیا گیا ہے اور دونوں یکساں جائز اور شائع وذائع ہیں بلکہ زحاف قطع جس سے متفاعلن سیدھا فعلاتن ہوتا ہے، بلا واسطہ ہے اور مفعولن کا زحاف متفاعلن میں خزل و تسکین سے حاصل ہوتا ہے اور شعر زیر نظر کی ضرب میں یہی فعلاتن (بتحرکات ثلثہ) واقع ہے-

جیسے علامہ شیخ عبداللہ بن محمد صالح خزرجی کے درج ذیل شعر میں:

و حباه من جم الفضائل والمکا
رم ما تکل بوصفه الشَفَتان

اس کا مطلع یہ ہے:

حمدا لفاتح جملة الانسان
شرفا بطه المصطفی العدنان

پہلے شعر کی ضرب فعلاتن کے وزن پر ہے اور مطلع میں عروض وضرب دونوں مفعولن کے وزن پر ہے-

اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی کے یہ دونوں قصائد شعری وفنی اعتبار سے شاہکار ہیں اور فاضل بدایونی نے جو تحقیقی تجزیہ پیش کیا ہے یہ دادو تحسین سے بے نیاز ہے-

آخر میں عرض ہے کہ مولانا شیخ اسید الحق ہمارے درمیان نہ رہے ان سے عراق کی حاضری سے پہلے فون پر خیالات کا تبادلہ ہوتا رہا، بعض امور کی طرف میں نے انھیں متوجہ کیا تھا، تحقیقی تجزیہ کے ساتھ قصیدتان رائعتان کی اشاعت ہوچکی تھی، آئندہ اشاعت میں کچھ ترمیمات کا ارادہ ظاہر کیا تھا، اگر وہ ہمارے درمیان ہوتے تو مجھے یہاں لکھنے کی ضرورت نہ ہوتی مولانا نے جس حذف و ترمیم کا مشورہ قبول کیا تھا ان میں سے یہ بھی تھا-

(۱) اشعار کی تقطیع ہمیشہ معروف وزن کے ساتھ کی جاتی ہے جب زحافات سے رکن میں تبدیلی ہوتی ہے تو ہمیشہ ان ٹکڑوں کو معروف وزن میں تبدیل کرلیا جاتا ہے، مثلاً مفاعی لن پر جب خرم کا عمل ہوگا یعنی وتد مجموع کا پہلا حرف گر جائے گا تو مابقی فاعیلن ہوگا، اسے مفعولن سے بدلا جائے گا، یونہی متفاعلن پر جب اضمار کا عمل ہوگا تو یہ مُتْفَاعلن ہوجائے گا اسے مستفعلن سے بدل دیا جائے گا- وغیرہ

(۲) تحقیقی جائزے میں بحر کامل مجزو کی وضاحت یوں کی گئی ہے کہ "ہر شطر میں تین کی بجائے صرف دو دو تفعیلات ہی ہوں" یہاں تک تو صحیح ہے لیکن اس کے بعد کی عبارت "یعنی عروض اور ضرب دونوں حذف کردیے جائیں" صحیح نہیں ہے، کیونکہ ایک شعر کی تشکیل صدر وابتدا اور عروض وضرب سے ہوتی ہے، اس کے درمیان کے تفعیلات حشو کہلاتے ہیں، اس لیے کوئی شعر صدر وابتدا اور عروض وضرب کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتا- بہ الفاظ دیگر ایک شعر میں کم سے کم چار رکن کا ہونا ضروری ہے- دو رکن مصرع اول میں اور دو رکن مصرع ثانی میں-

پہلے مصرعے کے دو رکن یہ ہیں، صدر و عروض، پہلا رکن صدر کہلاتا ہے اور دوسرا رکن عروض- اسی طرح دوسرے مصرع کے دو رکن یہ ہیں، ابتدا وضرب، اس دوسرے مصرع کے پہلے رکن کو ابتدا اور دوسرے رکن کو ضرب کہتے ہیں، اس کے درمیان کے جتنے ارکان ہیں وہ

سب کے سب حشو کہلاتے ہیں-

(۳) بحر کامل میں زحاف وقص کو تجزیہ نگار نے عیب قرار دیا ہے- یہ صحیح نہیں ہے، کوئی زحاف معیوب نہیں ہوتا، بلکہ یہ بحر کے مختلف اوزان کی تشکیل میں حصہ دار ہوتے ہیں- ہاں یہ صحیح ہے کہ فاضل بریلوی کے ان دو قصائد میں سے کسی میں یہ زحاف واقع نہیں ہوا ہے، اس لیے نہیں کہ یہ عیب ہے بلکہ اس لیے کہ اس زحاف کا یہ محل نہیں ہے-

(ماہنامہ جام نور، عالم ربانی نمبر، اپریل ۲۰۱۴ء)

وہی جو مستوی عرش ہے

عارف باللہ سرکار آسی غازی پوری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا معروف شعر ؎

وہی جو مستوی عرش ہے خدا ہوکر
اتر پڑا ہے مدینہ میں مصطفی ہوکر

راقم نے دار العلوم اشرفیہ مبارک پور کے زمانۂ طالب علمی میں سنا تھا اور منتہی طلبہ کے درمیان کی ''ہے'' اور ''تھا'' کے تعلق سے علمی بحثیں اب بھی یاد ہیں۔ اب تقریبا ۵۵/برس کے بعد رسائل و جرائد میں اس پر اظہارِ خیال کیا جا رہا ہے اور احقر کو بھی اس مجلس علمی میں شرکت کی دعوت دی گئی ہے۔

اہل قلم کا ایک طبقہ شعر مذکور کو کسی تاویل کے بغیر اپنے مفہوم مراد میں صریح قرار دیتا ہے اور ایک طبقہ تاویل کے بعد بھی مطمئن نہیں ہے۔

اس سلسلے میں صدر الشریعہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا فتویٰ جو محض چند سطروں پر مشتمل ہے،، بہت وقیع ہے، اسے دقت نظر سے دیکھنا چاہیے۔

اس میں شک نہیں کہ سرکار آسی کی غزل جس کا مطلع مذکور ہوا، آپ کے زمانۂ حیات میں شائع ہو چکی تھی اور پسند خاطر ہوکر کہہ ومہہ کی زبانوں پر تھی اور اس میں بھی کلام نہیں کہ مذکورہ بالا شعر ''تھا'' کے ساتھ تھا۔ اسی لئے ظاہر ہیں، کم علم اور ذوق سخن و مزاج شعری سے عاری قارئین نے اسے نشانۂ تنقید بنایا اور یہ بھی اظہر من الشمس ہے کہ سرکار آسی کو اس شعر کے تعلق سے ردعمل کا علم ہوا تھا۔ اگر آپ کو اس کی خبر نہ ہوتی تو یہ ارشاد نہ ہوتا کہ ''میاں شاہد! جہلا اس شعر پر اعتراض کریں گے''۔ اگر چہ ''کریں گے'' صیغۂ مستقبل ہے، لیکن مرتب عین المعارف کا یہ لکھنا کہ ''حضرت کا ایک مطلع ہے جس پر کم علم مولویوں نے کفر وشرک کا فتویٰ دینے سے دریغ نہیں کیا'' کیا یہ ظاہر نہیں کرتا کہ حضرت مرتب کے ذریعے کفر وشرک کے فتویٰ کی خبر سرکار آسی کو

ہو چکی تھی، ''جہلا'' کا لفظ اسی کا مُشعر ہے، ممکن ہے سرکار آسی کی زبان سے جو کلمات ادا ہوئے ان کو مولانا شاہد نے اپنے لفظوں میں بیان کیا ہو، پھر بھی ''کریں گے'' سے میں نہیں سمجھتا کہ سرکار آسی کو اعتراض کا علم نہیں تھا۔ اہل ایقان وعرفان کا یہ انداز بیان ہر کسی کو نصیب کہاں۔

عین المعارف میں حضرت سبز پوش رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''حضرت نے جب یہ غزل کہی تھی میں خدمت میں حاضر تھا۔ مطلع یہ ہے ؎

وہی جو مستوی عرش ہے خدا ہو کر
اتر پڑا ہے مدینہ میں مصطفی ہو کر

جب یہ مطلع فرمایا تو میری طرف مخاطب ہو کر فرمایا ''میاں شاہد! جہلا اس شعر پر اعتراض کریں گے مگر ان کے اعتراض کا جواب مصرعۂ اولیٰ میں موجود ہے یعنی وہ اب بھی مستوی علی العرش ہے۔''

مرتب عین المعارف کا ارشاد کہ غزل ان کی موجودگی میں کہی۔ اس سے مستفاد ہے کہ ابھی یہ تازہ غزل نہ چھپی تھی نہ کسی مجلس میں پڑھی گئی تھی بلکہ ''جب یہ غزل کہی تو میں خدمت میں حاضر تھا'' پھر اسی دوران حضرت کا یہ ارشاد فرمانا کہ ''میاں شاہد! جہلا اس شعر پر اعتراض کریں گے'' اسے ذہن قبول نہیں کرتا، عین المعارف کی ترتیب وتدوین بعد میں ہوئی ہے۔ اس لئے اس پر تنقیدی نظر ڈالنا ضروری ہے۔

اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ کفر وشرک کے فتویٰ کا علم حضرت کو ہو چکا تھا تو صاف ظاہر ہے کہ ''جہلا'' سے وہی پڑھے لکھے، لوگ مراد ہیں جنھوں نے علم حاصل کر کے بھی اس کا حق ادا نہیں کیا یعنی پڑھے لکھے جاہل، اور فتویٰ اسی وقت دیا گیا ہوگا جب یہ غزل عام ہو چکی ہوگی، جرائد کے ذریعے یا مشاعروں کے واسطے سے۔ اس لئے غزل کو نظم کرتے ہی حضرت کا یہ ارشاد کہ ''جہلا اس شعر پر اعتراض کریں گے'' اس "ارشاد" کی نسبت کو ذہن قبول نہیں کرتا۔

جیسا کہ عرض کیا گیا یہ شعر کہ و مہ تک ''تھا'' کے ساتھ پہنچا اور بے شبہ ''تھا'' کے ساتھ ہی سائل نے حضرت صدر الشریعہ سے استفتا بھی کیا اور یقیناً مفتی نے سائل کے سوال کی روشنی

میں ہی جواب دیا، اب یہ کہنا کہ کاتب کی عجلت کتابت سے ''ہے''، ''تھا'' ہوگیا یہ غیر ضروری طور پر صدرالشریعہ کا دفاع کرنے کی کوشش ہے۔ صدرالشریعہ نے جولکھا ہے اس کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ صدرالشریعہ فقیہ تھے، زبان، عرف اور محاورات سے کما حقہ واقف تھے۔

آپ اچھی طرح جانتے تھے کہ ''ہے'' اور ''تھا'' میں فرق ہے مگر آپ کو یہ بھی معلوم تھا کہ ہر جگہ ''تھا''، ''ہے'' کی نفی کو مستلزم نہیں ہوتا۔ بلکہ کہیں کہیں ''تھا'' کی جگہ ''ہے'' رکھ دیا جائے تو مفہوم مراد میں کوئی فرق لازم نہیں آتا اس لئے آپ نے اپنے فتویٰ میں مستوی عرش اور اترنا کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا، ''تھا'' اور ''ہے'' پر زور صرف نہیں کیا۔ ''تھا'' اگر قابل اعتراض ہوتا تو اس معروف شعر پر ''تھا'' اور ''ہے'' کے تعلق سے بھی اظہار خیال فرماتے، لیکن آپ نے اس کی ضرورت نہیں سمجھی، وجہ یہی تھی کہ لفظ ''تھا'' سے ''ہے'' کی نفی لازم نہیں۔ ارشاد باری ہے:

مَا كَانَ اِبْرٰهِيْمُ يَهُوْدِيًّا وَّ لَا نَصْرَانِيًّا وَّ لٰكِنْ كَانَ حَنِيْفًا مُّسْلِمًاؕ وَ مَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْن.

ترجمہ: ابراہیم نہ یہودی تھے نہ نصرانی بلکہ باطل سے جدا مسلمان تھے اور مشرکین سے نہ تھے۔

یہاں کلام الٰہی کے ترجمہ میں تین جگہ ''تھے'' آیا ہے اور کسی ایک جگہ بھی ''تھے'' ہے کی نفی کو مستلزم نہیں ہے۔

مزید وضاحت کے لئے سورۂ یوسف کی درج ذیل آیت کے چار اردو ترجمے ملاحظہ ہوں:

آیۂ کریمہ: قَالُوْا يٰۤاَبَانَا اسْتَغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَاۤ اِنَّا كُنَّا خٰطِـِٕيْنَ(۹۷)

ترجمۂ امام احمد رضا:

''بولے اے ہمارے باپ ہمارے گناہوں کی معافی مانگئے۔ بے شک ہم خطا وار ہیں''۔ [کنز الایمان]

ترجمۂ محدث اعظم ہند:

''سب نے عرض کیا اے ہمارے باپ مغفرت چاہیئے ہماری، ہمارے گناہوں کی، در حقیقت ہم خطا کار تھے''۔ [سید التفاسیر]

ترجمۂ شاہ عبد القادر:

''بولے اے باپ بخشوا ہمارے گناہوں کو، بے شک ہم تھے چوکنے والے''۔

ترجمۂ شاہ رفیع الدین:

''کہا انھوں نے اے باپ بخشش مانگ واسطے ہمارے، گناہوں ہمارے کی، تحقیق ہمیں تھے خطا کرنے والے''۔

یہاں ایک ترجمہ ''ہیں'' کے ساتھ ہے۔ باقی تین ترجموں میں ''تھے'' ہے۔ اور یہ سب ترجمے بے داغ ہیں۔ جس کی وجہ ظاہر ہے۔

حدائق بخشش میں ہے ۔

قسم شب تار میں راز یہ تھا کہ حبیب کی زلف دوتا کی قسم

یہاں بھی "تھا" کا استعمال "ہے" کی نفی کو مستلزم نہیں ہے۔ اس مصرعے کو یوں بھی پڑھ سکتے ہیں ۔

قسم شب تار میں راز یہ ہے کہ حبیب کی زلف دوتا کی قسم

بلکہ میں اتنی جسارت اور کروں گا کہ کیا عجب کہ ناسخ اسکول کے نمائندہ شاعر، حضرت آسی جو شعری مزاج اور لطافت زبان کے حامل تھے، الفاظ کے درو بست، عرف اور محاورے سے کما حقہ واقف تھے، آپ نے اولاً یہ مصرع یوں ہی نظم کیا ہو۔

وہی جو مستوی عرش ہے خدا ہوکر

اور جب اِدھر اُدھر سے اعتراضات نے سر ابھارا ہو تو آپ نے رفع شر کے لئے ''تھا'' کو ''ہے'' سے تبدیل کرلیا ہو۔ اس لئے نہیں کہ وہ غلط تھا بلکہ اس لئے تاکہ عوام کے لئے بھی مفہوم کی ترسیل آسان ہو جائے۔

اور بعض اہل علم کا یہ کہنا کہ اترنا باعتبار نزول صفات کے ہے۔ مجھے اس میں کلام ہے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ کی ذات سے اس کی صفات منفک نہیں ہیں۔ اِلا یہ کہ قائل کی مراد نزول صفات سے نزول تجلیات ہو۔ اس شعر کی تشریح میں صدر الشریعہ کا فتویٰ میرے نزدیک حرف آخر ہے۔

حدیث الحبۃ السوداء کی تشریح

چند برسوں سے کلونجی کے فوائد پر رسالے چھپ رہے ہیں، اخبارات کے ذریعے مشتہری ہورہی ہے، بالخصوص روغن کلونجی کا کافی چرچا ہے اور یہ سب کچھ حدیث رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے حوالے سے ہورہا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ کلونجی کے بہت سے طبی فوائد ہیں اور یہ بھی صحیح ہے کہ اس کی فضیلت حدیث میں یوں آئی ہے۔ الحبة السوداء شفاء من کل داء الاالسام۔ یعنی کلونجی دوائے شافی ہے ہر مرض کے لیے موت کے سوا، حدیث کے ظاہر الفاظ سے یہ سمجھ لیا گیا کہ دنیا میں جتنے امراض ممکنہ ہیں اور وہ امراض خواہ درجۂ ابتداء میں ہوں یا درجہ انتہا میں کلونجی جملہ امراض کی تیر بہدف دوا ہے۔ مگر کیا فی الواقع حدیث کا یہی مفہوم ہے؟ ہم نے دہلی میں بعض اساتذہ علم حدیث سے گفتگو کی ہر ایک نے یہی بتایا کہ ہاں یہی مفہوم ہے جب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا ہے تو اس میں شک وشبہ کیسے ہوسکتا ہے، جب گفتگو آگے بڑھی تو کہا گیا کہ حدیث شریف میں لفظ ''مِن کل داء'' آیا ہے اس لیے مرض کی کوئی قسم اور کوئی فرد اس کل سے باہر نہیں ہے اور ''الاالسام'' نے جملے کو اور بھی روشن کردیا ہے، اس کے بعد کہا گیا کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے بارے میں قرآن حکیم ناطق ہے۔ وما ینطق عن الھوی ان ھو الا وحی یوحی۔ ہم نے عرض کیا کہ قرآن وحدیث پر ہمارا کامل ایمان ہے۔ صرف یہ عرض کرنا ہے کہ کیا حدیث کے ظاہر الفاظ کا حقیقی مفہوم یہی ہے؟ اور کیا عملاً یہ ہمارے مشاہدے میں ہے؟ بہرحال ہمیں تشفی نہیں ہوئی کیوں کہ کئی امراض ہماری نظر میں ہیں جن کا ازالہ دوائے نباتی سے بظاہر سمجھ میں نہیں آتا یوں تو خدا کی قدرت سے سب کچھ ممکن ہے بلکہ ہر دوا میں تاثیر من جانب اللہ ہی ہے یعنی مؤثر حقیقی ذات باری تعالیٰ کی ہے اس عقیدے کے تحت کسی ایک دوا کی کوئی تخصیص نہیں رہ جاتی۔

اسی کے ساتھ دو واقعات بھی سماعت فرمالیجئے۔ کوئی پندرہ برس پہلے کی بات ہے، جواہر لعل

نہرومیڈیکل کالج علی گڑھ کے ایک استاذ کا مضمون دہلی کے ایک میگزین میں شائع ہوا تھا انھوں نے فرمایا تھا کہ ایڈس (AIDS) کے استیصال کے لیے دنیا کے بہت سے ممالک ریسرچ کے نام پر کروڑوں ڈالرخرچ کرر ہے ہیں مگراب تک اس کی کوئی شافی دوا سامنے نہیں آئی، جب ہمارے نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ کلونجی ہر مرض کی شافی دوا ہے تو دنیا کیوں اپنے خزانے ضائع کررہی ہے؟ تیر بہدف دوا تو موجود ہے، جب فاضل قلم کار دہلی تشریف لائے اور ہم نے ان سے گفتگو کی تو وہ ہمیں مطمئن نہیں کر سکے بس یہی کہتے رہے کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی حدیث ہے جس پر ہمارا ایمان ہے۔ انھیں دنوں ایک صاحب غازی آباد سے تشریف لائے انھیں حکیم مظہر سبحان عثمانی صاحب کے داماد سے راقم الحروف کے بارے میں یہ معلوم ہوا تھا کہ یہ ناچیز علم جفر جانتا ہے، غازی آبادی صاحب نے کہا کہ میں نے علم جفر سے معلوم کیا ہے کہ کلونجی ایڈس کی صدفی صد شافی دوا ہے آپ میرے طریقہ حساب واستخراج کو ملاحظہ کر کے تصدیق کر دیجئے میں WHO کے آفیسران سے مل کر تجارتی طور پراس سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہوں۔ میں نے کہا کہ میں علم جفر کی ابجد سے بھی واقف نہیں ہوں، پھر میں نے کہا کہ شونیز سے حساب کیجئے دیکھئے کیا جواب آتا ہے وہ بغلیں جھانکنے لگے۔ معاً میرے ذہن میں آیا کہ موصوف کے پیش نظر کلونجی کی حدیث ہوگی ورنہ اتنا اعتماد علم جفر کے حساب سے ایک عام آدمی میں پیدا نہیں ہوسکتا تھا، میں نے جب کرید کی تو وہ کھل گئے کہ ہاں میرے پیش نظر حدیث رسول تھی، چوں کہ فرمودۂ رسول کا غلط ہونا ممکن نہیں ہے اور کلونجی کو ہر مرض کی شافی دوا کہا گیا ہے اس لیے ایڈس میں بھی اس کا سودمند ہونا یقینی ہے۔

راقم الحروف اس حدیث پاک کے ایک ایک لفظ کی فصاحت پر ایمان کامل رکھتے ہوئے اس کے مفہوم کی تشریح کرنا چاہتا ہے اگر میرے خیال سے اتفاق نہ ہو تو علم حدیث اور عرف ولغات عرب کا علم رکھنے والے حضرات میری اصلاح فرمادیں، ممنون ومتشکر ہوں گا۔ یہ ایک نازک اور حساس مسئلہ ہے اس کا تعلق علم نظری سے نہیں ہے عملی سے ہے، مشاہدے سے اس کی تصدیق لازم ہے۔

میرے غور وفکر کا اول مبنیٰ یہ ہے کہ اسلامی دور کے مسلم اطبا پہلے علم دین حاصل کرتے تھے،

علم شرائع میں کامل ہونے کے بعد علم طب کی تحصیل کی طرف راغب ہوتے تھے پھران میں کچھ وہ ہیں جنھوں نے تصنیفات کے ذریعہ علم طب کو فروغ بخشااور کچھ وہ ہیں جنھوں نے مطب کے ذریعے لاکھوں کروڑوں خلق خدا کو فائدہ پہنچایا، قدیم اطبا کا بہت کچھ سرمایہ موجود ہے، یقینا حدیث کلونجی سے یہ اطبا بے خبر نہیں تھے لیکن جہاں تک راقم کے مطالعہ میں قدیم کتابیں آئی ہیں، کلونجی کے استعمال کا ذکر اتنا نہیں ہے جتنا ظاہر مفہوم حدیث کے پیش نظر ہونا چاہیے۔ آخر ایسا کیوں ہے؟

دوسرا مبنیٰ یہ ہے کہ حکمائے طب نے بنیادی طور پر امراض کی تین قسمیں کی ہیں، سوءمزاج، سوءترکیب اور تفرق اتصال۔ ظاہر ہے کہ حدیث پاک میں ''داء'' کے ساتھ لفظ ''کل'' بھی واقع ہے اس لیے ''کل داء'' سوءمزاج، سوءترکیب اور تفرق اتصال سارے امراض کو محیط ہوا، لیکن میں یہ نہ سمجھ سکا اور نہ کوئی مجھے سمجھا سکا کہ اگر کسی کا کولہا سرک جائے یا عظم الفخذ میں کسر مرکب واقع ہوجائے یا کسی معمر اور ناتواں شخص کا پورا جسم برص مستحکم سے سفید اور چکنا ہوجائے، جلد کی قوت حس نام کو بھی باقی نہ رہ جائے ایسے میں کلونجی کا استعمال کیوں کر نافع ہوگا؟ خدا کی قدرت اور رسول کے معجزہ پر ہمارا ایمان ہے مگر اس میں کلونجی کی تخصیص نہیں ہے۔ اسی لیے خدا کی بارگاہ میں عجز بندگی کا اقرار کرتے ہوئے اور اس حدیث پاک کے ہر ہر لفظ پر اعتقاد رکھتے ہوئے راقم الحروف اس کی تشریح کرنا چاہتا ہے۔ مکرر عرض ہے کہ اگر میرا قدم راہ صواب سے بھٹک گیا ہو تو مجھے صحیح راستہ دکھایا جائے!

میرا خیال ہے کہ الفاظ ہمیشہ اپنے معنی موضوع لہ میں استعمال نہیں ہوتے۔ یہ صرف عربی زبان کی خاصیت نہیں ہے ہر زبان میں ایسا ہوتا ہے بے شک لغوی اعتبار سے حدیث پاک میں واقع ''لکل داء'' جملہ امراض کو شامل ہے لیکن عام محاورۂ عرب میں کسی شے کی اہمیت جتانے کے لیے یا جس شے کا استعمال کثرت سے ہوتا ہے یا جس شے کے اظہار میں مبالغہ مقصود ہوتا ہے ایسے مقام پر اکثر کی جگہ ''کل'' کا استعمال داخل فصاحت ہے۔ محاورۂ عرب میں ''للاکثر حکم الکل'' شائع وذائع ہے، میرے اس خیال کی تائید اس حدیث پاک سے ہوتی ہے ''کل بنی آدم خطاؤن و خیر الخطائین التوابون۔ ''یعنی سارے بنی آدم خطا کار ہیں اُن

خطا کاروں میں اچھے وہ لوگ ہیں جو سچی توبہ کرنے والے ہیں، اس حدیث میں بھی لفظ ''کل'' استعمال ہوا ہے اگر اسے اپنے معنی وضعی میں لیا جائے تو صحیح نہیں ہوگا۔ کیوں کہ سارے انبیاء ومرسلین علیہم الصلوٰۃ والتسلیم جو تقریباً ایک لاکھ چوبیس ہزار ہیں، معصوم عن الخطا ہیں حال آں کہ یہ سب کے سب اولاد آدم ہیں۔ ایک اور حدیث پاک ہے **کل بدعة ضلالة**۔ یعنی ہر بدعت گمراہی ہے، یہاں بھی لفظ ''کل'' استعمال ہوا ہے، محدثین نے اپنی کتابوں میں اس کی تشریح کرتے ہوئے صاف صاف لکھا ہے کہ بدعت کی ایک قسم **البدعة الحسنة** بھی ہے اور پھر بدعت حسنہ کی بہت سی مثالیں پیش کی ہیں۔ بلکہ فضائل بھی بیان کیے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ متذکرہ بالا حدیث کلونجی میں لفظ ''کل'' میں منطقی اصطلاح مفہوم نہیں ہے۔ اپنے عندیہ کی مزید تائید میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ جیسے فصیح العرب کا ایک قول بھی پیش کرنا چاہتا ہوں۔ پیرایۂ بیان کتنا مسحور کن ہے اور لفظ ''کل'' کا استعمال کیسا اچھوتا مفہوم رکھتا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے واقعہ یہ ہے کہ ایک مجلس میں حضرت فاروق اعظم نے مہر کے تعلق سے ایک حکم شرعی سنایا۔ یہ سنتے ہی ایک ضعیفہ بول اٹھی عمر آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ قرآن تو یہ کہتا ہے **وَآتیتم احدٰھن قنطارا**۔ یہ سننا تھا کہ فاروق اعظم ادنیٰ تاخیر کیے بغیر بول اٹھے، **کل احد اعلم من عمر** یعنی ہر ایک شخص عمر سے زیادہ علم والا ہے (ایک روایت میں **افقه** کا لفظ آیا ہے) اس سے ظاہر ہے کہ کلام عرب کو ہمیشہ لغت کے سہارے نہیں سمجھا جانا چاہیے عرف اور محاورات کو لغت پر من وجہٍ فضیلت حاصل ہے۔

رہا ''الا السام'' (موت کے سوا) سے استثنا جس کو **کل داءٍ** میں جملہ امراض ممکنہ کے شامل ہونے کا قرینہ سمجھا گیا ہے اسے بھی راقم الحروف بلاغت کلام کے زمرے میں شمار کرتا ہے اور کلونجی کے بیشتر امراض سوء مزاج میں نافع ہونے کی اہمیت بیان کرنے کے لیے بلیغ انداز تصور کرتا ہے۔ مشہور قول ہے **لافتی الا علی لاسیف الا ذو الفقار**۔ یعنی حضرت علی کے سوا کوئی بہادر نہیں اور ذوالفقار کے سوا کوئی تلوار نہیں۔ یہاں دو دو حرف استثنا موجود ہیں لیکن پورا جملہ اپنے حقیقی وضعی معنی سے عاری ہے اسی طرح عربی الفاظ کے ساتھ اردو میں ایک مثل مشہور ہے لغات کی کتابوں میں بھی مذکور ہے۔ یہ مثل کہاں سے زبانوں پر رائج ہوئی مجھے اس کی

تحقیق نہیں ہے لیکن فصحائے اردو نے اس مثل کو قبول کیا ہے اس لیے اس سے سند حاصل کی جاتی ہے۔ وہ مثل یہ ہے کل طویل احمق الا عمر، کل قصیر فتنة الا علی۔ یعنی ہر لمبے قد والا بے وقوف ہے سوائے حضرت عمر کے اور ہر چھوٹے قد والا فتنہ ہے سوائے حضرت علی کے۔

حاصل کلام یہ کہ یہ حدیث پاک ثقہ راویوں کے ساتھ کتب احادیث میں مذکور ہے۔ اس کے بے شمار فوائد طبی کتب میں مرقوم ہیں مفرداً بھی مرکباً بھی لیکن میرے خیال میں یہاں لفظ ''کل''للاکثر حکم الکل۔ کے مفہوم میں ہے، جملہ امراض، سوءمزاج، سوءترکیب اور تفرق اتصال کا احاطہ مفہوم نہیں ہے۔

حدیث رسول کے نام سے کچھ دواؤں کا ذکر نہ صرف طبی کتب میں بلکہ تساہل اور غفلت کے سبب بعض کتب احادیث میں بھی ملتا ہے جسے تحقیق کے بعد محدثین کرام نے موضوع قرار دیا ہے مثلاً لو یعلم الناس مافی الحلبة لاشتروها ولو بوزنها ذهبًا۔ یعنی اگر لوگوں کو میتھی کے بارے میں علم ہوتا کہ اس کے کیا کیا فوائد ہیں تو اسے ضرور بالضرور خریدتے خواہ اس کے وزن کے برابر سونا دینا پڑتا۔ اسی طرح کتب حدیث میں یہ حدیث بھی مذکور ہے البطیخ قبل الطعام یغسل القلب غسلا ویذهب بالداء اصلا۔ یعنی کھانے سے پہلے خربوزہ کا استعمال حوالی قلب کو پوری طرح صاف کر دیتا ہے اور بیماری کا استیصال کرتا ہے، امام احمد فرماتے ہیں کہ: لایصح فی فضل البطیخ شئ الا ان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ تعالیٰ علیه وسلم کان یأکله۔ لیکن حدیث کے نام پر یہ موضوعات کم سے کم یہ تو پتا دیتے ہیں کہ خربوزہ کی منفعت اپنی جگہ مسلم ہے یہ اور بات کہ کوئی کلام اپنے معنی کے اعتبار سے خواہ کتنا ہی مبنی بر حقیقت ہو اگر وہ ارشاد رسول نہیں ہے تو اس پر حدیث رسول کا اطلاق نہیں ہوگا۔

آخر میں عرض کرتا چلوں کہ احادیث کی بعض مطول شروح سے پتا چلتا ہے کہ محدثین کرام کا اس پر اتفاق نہیں ہے کہ الحبة السوداء کلونجی ہی ہے گو قول راجح یہی ہے کہ یہ کلونجی ہے۔

مسیح الملک کے سوانح نگاروں کے تسامحات

آیورویدک اینڈ یونانی طبیہ کالج (دہلی یونیورسٹی) نئی دہلی کے سالانہ میگزین ۱۹۸۸ء-۱۹۸۷ء میں مسیح الملک حکیم اجمل خان مرحوم کی مختصر سوانح حیات شائع ہوئی ہے۔ یہ مضمون اس اعتبار سے بہت وقیع ہے کہ اس کے مرتب حکیم سید کمال الدین ہمدانی پروفیسر اے، کے طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ہیں اس لیے مجھے احساس ذمہ داری نے مجبور کیا کہ اس کے چند ''محل نظر'' مقامات کی نشاندہی کردوں تاکہ صحیح صورت واضح ہوجائے۔

تاریخ وتذکرہ نگاری ایسا فن ہے جس میں دیانت کے ساتھ وقائع وحوادث کو ضبط تحریر میں لانا نہایت مشکل کام ہے جو لوگ چھان بین کی زحمت اٹھائے بغیر قلم اٹھاتے ہیں وہ اس فن کے ساتھ انصاف نہیں کرتے۔ میں عنوان بالا کے تعلق سے حکیم اجمل خان مرحوم سے متعلق پیدائش ووفات کی چند متخالف ومتضاد تحریریں پیش کرتا ہوں جو مضحکہ خیز بھی ہیں اور افسوسناک بھی۔ اس کے بعد اصل موضوع زیر بحث آئے گا۔

مسیح الملک حکیم اجمل خان ہندوستان کے ان چند نادرۂ روزگار افراد میں سے تھے جن پر بجا طور پر فخر کیا جاسکتا ہے۔ مرحوم کی ناگہانی موت ملک کا ایک عظیم اور ناقابل تلافی نقصان تھا جس پر ملک اور بیرون ملک کے اخبارات وجرائد نے اداریے لکھے، مختلف اداروں نے تعزیتی قراردادیں پاس کیں اور رہنمایانِ ممالک نے خراج عقیدت پیش کیے۔ لیکن سخت حیرت کا مقام ہے کہ مرحوم کے تذکرہ نگاروں کی تحریروں میں اپنے عظیم محسن کے سال وفات کے بارے میں زبردست اختلاف پایا جاتا ہے۔ اس افسوسناک اور متضاد تحریروں سے پہلے مسیح الملک کی تاریخ پیدائش میں سنۂ ہجری سے سنۂ عیسوی کے تطابق کی افسوس ناک مثال ملاحظہ ہو!

حکیم اجمل خان کی تاریخ پیدائش ۱۷رشوال ۱۲۸۴ھ بتائی جاتی ہے۔ اس پر سب کا اتفاق ہے لیکن سنۂ عیسوی سے اس کی مطابقت میں عجیب وغریب گلکاریاں کی گئی ہیں۔ قاضی عبدالغفار ''حیاتِ اجمل'' میں رقم طراز ہیں:

''حکیم صاحب ۱۷ر شوال ۱۲۸۴ھ/ ۱۸۶۳ء کو پیدا ہوئے''۔ (صفحہ: ۳۱)

حکیم کوثر چاند پوری اپنی کتاب ''حکیم اجمل خان'' میں رطب اللسان ہیں:

''۱۷ر شوال ۱۲۸۴ھ مطابق ۱۸۶۴/ ۱۸۶۵ء کو شریف منزل میں ایک ایسا آفتاب طلوع ہوا''۔ (صفحہ: ۱۴۲)

پروفیسر کمال الدین خامہ فرسا ہیں:

''حکیم اجمل خان ۱۷ر شوال ۱۲۸۴ھ مطابق ۱۸۶۷ء میں پیدا ہوئے''۔ (میگزین محولہ ص: ۷)

ظاہر ہے کہ ۱۷ر شوال ۱۲۸۴ھ کسی ایک ہی تاریخ اور سنۂ عیسوی کے مطابق ہوگی۔ کسی شخص کی تاریخ پیدائش کے بیانِ روایت میں تو اختلاف ممکن ہے لیکن سنۂ ہجری پر اتفاق کر لینے کے بعد سنۂ عیسوی میں اتنا زبردست اختلاف نا قابل فہم ہے۔ حکیم کوثر چاند پوری نے تو ۱۷ر شوال ۱۲۸۴ھ کو ۱۸۶۴ء ۱۸۶۵ء کے مطابق لکھ دیا ہے۔ حالانکہ ۱۲۸۴ھ کے ماہ شوال کی سترہویں تاریخ کے ۶۴ء و ۶۵ء میں تقسیم ہونے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ ان اختلافات کی بوقلمونی اور ارباب قلم کی بے احتیاطی سے پریشان ہو کر ہم نے گھنٹوں سر کھپایا تو تقویمی تطابق کا نتیجہ یوں برآمد ہوا۔

۶ر رمضان المبارک ۱۲۸۴ھ مطابق یکم جنوری ۱۸۶۸ء

یکم شوال المکرم ۱۲۸۴ھ مطابق ۲۶ر جنوری ۱۸۶۸ء

۱۷ر شوال المکرم ۱۲۸۴ھ مطابق ۱۱ر فروری ۱۸۶۸ء

یوں قاضی عبد الغفار سے لے کر ہمدانی صاحب تک کی ساری مطابقتیں غلط قرار پاتی ہیں۔ ہمارے نزدیک صحیح یہ ہے کہ مسیح الملک حکیم اجمل خان مرحوم ۱۷ر شوال المکرم ۱۲۸۴ھ بمطابق ۱۱ر فروری ۱۸۶۸ء پیدا ہوئے تھے۔

یہ تو مسیح الملک کی تاریخ پیدائش کا ذکر تھا۔ جس کو تقریباً ایک سو پچیس برس کا عرصہ ہو چکا ہے ستم تو یہ ہے کہ خود مسیح الملک کے جانشینوں کی تحریروں میں آں مرحوم کے سنہ وفات کا اختلاف موجود ہے۔ حکیم محمد الیاس خاں مرحوم ناظم مجلس تحقیقات علمی نے ''قانونِ عصری'' میں

لکھا ہے کہ:

"مذکورہ بالا اصول اور اسلوب پر آخر ۱۹۲۷ء کے اُن نامبارک لمحوں تک مسیح الملک کی قیادت میں ریسرچ کا کام ہوتا رہا جب کہ انھوں نے اپنی جان جاں آفریں کو اور اپنا طبی مشن اپنے جانشینوں کو سپرد کیا"۔ (ص: ۳۷)

اب اسی کے ساتھ مجلس تحقیقاتِ علمی کے ایک اہم رکن زبدۃ الحکما حکیم کبیر الدین مرحوم کی درج ذیل عبارت ملاحظہ ہو جو کتاب کلیات ادویہ کے دیباچے میں ہے:

"اس عہد نامہ کے متعلق ریسرچ کا کام اسی وقت سے (۲ر جولائی ۱۹۲۶ء) شروع کر دیا گیا اور آخر دسمبر ۱۹۲۸ء تک جب کہ بانی مجلس نے داعی اجل کو لبیک کہا، تقریباً ڈھائی برس کے عرصے میں بحث و تمحیص اور فکر و نظر کے نتائج کا اچھا خاصا مواد جمع ہو گیا"۔ (ص:۱۹)

اس عبارت سے واضح ہے کہ مسیح الملک کا انتقال ۱۹۲۸ء میں ہوا تھا اور ڈھائی سال کے عرصے کا اضافہ کر کے ۱۹۲۸ء کے سالِ رحلت کو باوزن بنا دیا گیا ہے۔ ایسا بھی نہیں ہے کہ ۲ر جولائی ۱۹۲۶ء کاتب کی غلطی کا نتیجہ ہو کیوں کہ مجلس تحقیقاتِ علمی کا قیام ۲ر جولائی ۱۹۲۶ء ہی کو بمقام راجپورہ، دہرہ دون عمل میں آیا تھا۔ مگر سچ یہ ہے کہ مسیح الملک کا انتقال آخر دسمبر ۱۹۲۷ء میں (۲۷/۲۸ دسمبر کی درمیانی شب میں) بمقام رامپور ہوا تھا۔

حکیم کبیر الدین جیسی **قدآور** شخصیت کی اس تحریر کا انجام یہ ہوا کہ آج تک یہ غلطی دہرائی جاتی ہے۔ پروفیسر کمال الدین ہمدانی نے مسیح الملک کا سالِ وفات تحریر کرنے میں علامہ کبیر الدین ہی کی تاسی کی ہے۔

اب آیئے اسی نقطۂ نظر سے حکیم سید کمال الدین ہمدانی کے مضمون کا جائزہ لیا جائے جو طبیہ کالج قرول باغ کے سالانہ میگزین ۱۹۸۷/۱۹۸۸ء میں شائع ہوا ہے۔

تصانیف کے تحت:

(۱) "قیام رام پور کے زمانہ میں حکیم صاحب نے متعدد کتابیں تصنیف فرمائیں:

القول المرغوب فی الماء المشروب، رسالہ طاعون التحفة الحامدية فی الصناعة التكليسية، ايقاظ النعسان فی اغاليط غاية الاستحسان، اوراق مزہرہ اور البیان الحسن بشرح لمعجون المسمیٰ باکسیر البدن رام پور ہی میں تصنیف فرمائیں"۔ص:۸

ہمدانی صاحب نے القول المرغوب فی الماء المشروب کو قیام رامپور کے دور کی تصنیفات میں شمار کیا ہے جب کہ ہمدانی صاحب نے طبیب خاص کے عہدہ پر تقرر کا زمانہ ۱۸۸۲ء تحریر کیا ہے، جو خلاف واقعہ بھی ہے اور خلاف قیاس بھی،(۱) محض پندرہ سولہ برس کی عمر میں نواب رامپور کے طبیب خاص کے عہدہ پر تقرر کو ذہن قبول نہیں کرتا، صحیح یہ ہے کہ القول المرغوب حکیم اجمل خان کی پہلی (عربی زبان میں) تصنیف ہے جو زمانۂ طالب علمی کا اہم علمی کارنامہ ہے۔ حکیم صاحب خود اس رسالہ کے خطبے میں لکھتے ہیں:

"انی حين تلمذی علی اخی المستغرق فی علم الابدان حاذق الملک الحكيم عبد المجيد خان املأت رسالة فی تغذية الماء المشروب و سميتها بالقول المرغوب"۔

جس کا مفہوم یہ ہے کہ حکیم اجمل خان نے یہ رسالہ اس وقت لکھا جب وہ اپنے بڑے بھائی حاذق الملک حکیم عبدالمجید خان سے علم حاصل کر رہے تھے۔ حکیم اجمل خان نے اس رسالہ کی تصنیف کا زمانہ بھی متعین کر دیا ہے۔ جس کی عبارت یہ ہے:

"الرسالة الاولیٰ القول المرغوب فی الماء المشروب التی املتئها فی سنة ۱۳۰۵ من الهجرة"۔

یعنی پہلا رسالہ القول المرغوب فی الماء المشروب ہے جسے میں نے ۱۳۰۵ھ میں لکھا ہے اس لئے یہ کتاب قیام رامپور کے دوران کی نہیں ہے بلکہ اس سے بہت پہلے کی ہے۔

ہمدانی صاحب نے ایقاظ النعسان کو حکیم اجمل خان کی تصنیفات میں شمار کیا ہے جو صحیح نہیں ہے بلکہ یہ کتاب حکیم شفیق الرحمن رام پوری کی تصنیف ہے۔ لکھنؤ اسکول کے ایک جید طبیب حکیم عبدالوحید لکھنوی (برادر خرد شیخ الہند حکیم عبدالعزیز لکھنوی بانی تکمیل الطب کالج لکھنؤ) نے غاية الاستحسان

(۱) اضافہ! غالباً نواب حامد علی خان بہادر والی ریاست رامپور نے ریاست کی باگ ڈور سنہ ۱۸۹۶ میں سنبھالی تھی۔

فی حس مخ الانسان تالیف فرمائی جس میں حاذق الملک حکیم عبد المجید خان دہلوی کے اس نظریہ کا رد کیا گیا تھا کہ مخ دماغ میں حس نہیں ہوتی۔ حکیم عبد الوحید لکھنوی نے یہ دعویٰ کیا کہ مخ انسان میں حس ہوتی ہے۔ اس کتاب کے جواب میں حکیم شفیق الرحمن رام پوری نے **ایقاظ النعسان فی اغالیط غایۃ الاستحسان** تالیف کی۔ غایۃ الاستحسان ۱۲۹۹ھ میں مطبع انوار احمدی لکھنؤ میں چھپی اور ایقاظ النعسان ۱۳۲۴ھ میں افضل المطابع دہلی سے مطبوع ہوئی۔ اس سے زیادہ حیرت کی بات یہ ہے کہ ''نزھۃ الخواطر'' میں بھی ایقاظ النعسان کو حکیم اجمل خان کی تصنیفات میں شمار کیا گیا ہے۔ ممکن ہے ہمدانی صاحب کا ماخذ یہی کتاب ہو اور اس کتاب کے مصنف کو ان اشتہارات سے دھوکا ہوا ہو جو مجلہ طبیہ اور دفتر مدرسہ طبیہ کی دیگر کتب میں دیے جاتے رہے ہیں۔ جن میں ''تصانیف عالی جناب افسر الاطباء حکیم اجمل خان صاحب'' کے ذیل میں اس کتاب کی بھی خوب خوب مشتہری ہوئی۔ بہر حال غلطی کی بنیاد کچھ بھی ہو، اس وقت ایقاظ النعسان میرے پیش نظر ہے۔

> (۲) ''۱۹۰۲ سے ۱۹۰۴ء تک حکیم صاحب کا قیام زیادہ تر دہلی میں رہا اور اس زمانے میں دو طبی کارنامے انجام دیے ایک تو مدرسہ طبیہ کا میگزین مجلہ طبیہ کے نام سے شائع کیا، یہ ایک ماہوار رسالہ تھا جس میں مدرسہ کی خبروں کے علاوہ طبی مضامین بھی شائع ہوتے تھے۔ اس رسالہ کی ادارت کے فرائض حکیم سید عبد الرزاق معلم تشریح سے متعلق رہے ''۔ ص:۸

ہمدانی صاحب کے بقول مجلہ طبیہ کو حکیم اجمل خاں نے جاری فرمایا لیکن مجلہ طبیہ کی زبان کچھ اور کہتی ہے، ملاحظہ ہو مجلہ طبیہ شمارہ نومبر ۱۹۱۴ء جلد ۱۲ نمبر ۱۱ ضمیمہ ص: ۳:

> ''آپ کے بعد (یعنی حاذق الملک حکیم عبد المجید خان کے انتقال کے بعد۔ مصباحی) عالی جناب حکیم محمد واصل خاں مرحوم و مغفور نے اپنے برادر مکرم حاذق الملک اول کے قدم بہ قدم اس فن شریف کی اشاعت میں گہری دلچسپی کے ساتھ حصہ لیا اور آپ نے علاوہ مدرسہ طبیہ

کی اعلیٰ خدمات کے یہ کام کیا کہ مدرسہ طبیہ کے اسٹاف میں سے بعض کو
تحریک دے کر مجلہ طبیہ رسالہ جاری فرمایا جواب تک نہایت آب وتاب
کے ساتھ طبی منافع سے ملک کو فائدہ پہنچا رہا ہے''۔ ص: ۳

ہمدانی صاحب کی عبارت سے واضح ہے کہ حکیم سید عبدالرزاق صاحب معلم تشریح مجلہ طبیہ کے وقت اجرا ہی سے اس کے ایڈیٹر کے فرائض انجام دے رہے تھے حال آنکہ یہ ماہوار رسالہ حکیم مقصود علی خاں رشدی کی ادارت میں جاری ہوا تھا۔ ''بدن کی ساخت'' کے عنوان سے ایک مسلسل مضمون حکیم سید عبدالرزاق صاحب کا شائع ہوا کرتا تھا۔ مجلہ طبیہ شمارہ اکتوبر ۱۹۰۷ء میں جلسۂ دارالمباحثہ کے تحت کی ایک عبارت ملاحظہ ہو جو واضح کرتی ہے کہ حکیم سید عبدالرزاق صاحب کا مجلہ طبیہ کی ادارت سے ابتداءً کوئی تعلق نہیں تھا:

> ''۳/ستمبر روز سہ شنبہ عالیجناب حکیم حافظ محمد اجمل خاں صاحب کی خدمت میں طبیہ کلب کا حسب ذیل ڈیپوٹیشن حاضر ہوا۔ عالیجناب حکیم محمد احمد خان صاحب پریسیڈنٹ کلب، عالیجناب حکیم محمد غلام کبریا خاں صاحب وائس پریسیڈنٹ کلب، عالیجناب مولوی حکیم عبد الرشید خاں صاحب ممبر کلب، عالیجناب حکیم سید عبدالرزاق صاحب ممبر کلب، عالیجناب محمد سلطان صاحب ضیاء سکریٹری کلب، خاکسار ایڈیٹر ممبر کلب''۔

اس کے علاوہ مجلہ طبیہ شمارہ دسمبر ۱۹۰۷ء صفحہ ۱۶/ پر صاف صاف ''حکیم مقصود علی خاں رشدی ایڈیٹر'' مندرج ہے۔ حوالہ جات کی ضرورت یوں پیش آئی کہ مجلہ طبیہ کے ٹائٹل پر یا آخری صفحے پر کہیں بھی اڈیٹر کا نام مندرج نہیں ہے صرف مجلہ کے مہتمم صاحبان کے نام لکھے گئے ہیں۔

> (۳) ''دوسرا اہم کام مفرد دواؤں کی بہم رسانی اور مرکب دواؤں کی تیاری کے لئے یونانی اینڈ ویدک مڈیسنز کمپنی کا اجرا تھا''۔ ص:۸

جہاں تک میرا حافظہ رفاقت کر رہا ہے، میں نے مجلہ طبیہ کے کسی شمارے میں صاف صاف لکھا دیکھا ہے کہ اس کمپنی کا اجرا حکیم محمد واصل خاں صاحب مرحوم ومغفور نے کیا تھا، مگر افسوس کہ مجلہ کا وہ شمارہ میرے پیش نظر نہیں ہے۔ میری اس یادداشت کی تائید کوثر چاند پوری کی

کتاب ''حکیم اجمل خان''، ص: ۱۴۰ کی عبارت سے بھی ہوتی ہے۔ ممکن ہے اس کا ماخذ بھی مجلہ طبیہ ہی ہو۔ اس ضمن میں ایک اشتہار کا حوالہ غالباً نامناسب نہ ہوگا جو مجلہ طبیہ میں مسلسل شائع ہوتا رہا ہے۔ اشتہار کی عبارت یہ ہے:

۱۴راکتوبر ۱۹۰۳ء کو یہ کمپنی بہ سرپرستی و زیرنگرانی حاذق زماں عالی جناب حکیم حافظ محمد اجمل خاں صاحب جاری ہوگئی ہے''۔

اس اشتہار سے مترشح ہے کہ ۱۴راکتوبر سے پہلے یہ کمپنی کسی اور کی زیرسرپرستی و نگرانی تھی''۔

(۴) ''ہندوستان میں جاہل اور ناقابل دائیوں کی وجہ سے عورتوں اور نومولود بچوں پر غلط تدابیر اور علاج سے بڑا ظلم ہوتا تھا۔ مسیح الملک حکیم اجمل خاں نے اس مصیبت عظمیٰ سے بچانے کے لئے ایک زنانہ طبی مدرسہ کی تحریک شروع کی اور تھوڑے ہی عرصہ میں چالیس ہزار روپے فراہم کرلیا۔ اس مدرسہ کا افتتاح ۱۹۰۸ء میں لیڈی سرلوئی ڈین لفٹننٹ گورنر پنجاب نے کیا''۔ ص:۹

فاضل مضمون نگار نے صحیح عکاسی نہیں فرمائی۔ دراصل جاہل اور ناقابل دائیوں کی وجہ سے جو نقصان ہوتا تھا اس کے تدارک کے لئے حکیم اجمل خان نے مدرسہ دائیاں کی تحریک کی تھی۔ چناں چہ ۱۸راپریل ۱۹۰۶ء کو مدرسہ طبیہ گلی قاسم جان میں ایک جلسۂ عام ہوا جس میں مدرسہ دائیاں کے اغراض و مقاصد پیش کیے گئے اور ایک سب کمیٹی کا قیام زیرعمل آیا جس کے صدر حکیم اجمل خاں اور سکریٹری بابوشیونرائن پلیڈر بنائے گئے اور ۱۹ر دیگر معززین شہر کو اس کا ممبر بنایا گیا (جس میں فرہنگ آصفیہ کے مرتب مولوی سید احمد دہلوی بھی تھے) مدرسہ دائیاں کے نام سے ایک رپورٹ ۱۹۰۶ء میں چھپ کر شائع ہو چکی ہے۔ پھر جب چندہ کی باقاعدہ تحریک عمل میں آئی تو کان پور، قنوج، کیتھل، فرخ آباد، شملہ، اٹاوہ وغیرہ کے لئے محصل بھیجے گئے اور اسنادِ سفارت دی گئیں۔ البتہ جب یہ مدرسہ اپنی اسکیم کے تحت جاری ہوا تو بوجوہ چند اس کا نام مدرسہ طبیہ زنانہ رکھا گیا اور اس کا افتتاح ۱۳ر جنوری ۱۹۰۹ء کو پنجاب کے لفٹننٹ گورنر

بہادر کی اہلیہ ایڈتھ ڈین کے ذریعہ عمل میں آیا۔

ہمدانی صاحب نے مدرسہ دائیاں کا ذکر نہیں فرمایا جب کہ اسی نام سے تحریک کا آغاز ہوا نیز موصوف نے مدرسہ طبیہ زنانہ کا سال افتتاح ۱۹۰۸ء قرار دیا ہے جب کہ اس وقت کی روئدادیں ۱۳/جنوری ۱۹۰۹ء پر شاہد ہیں۔(بحوالۂ روئداد انجمن طبیہ ۱۹۱۱ء/۱۹۱۰ء مصححہ حکیم اجمل خاں مرحوم، وفہرست ادویہ ہندوستانی دواخانہ ۱۹۱۳ء)

''بیرونی ممالک کا سفر'' کے تحت:

> (۵) ''حکیم عبدالمجید خان کی وفات ۱۹۰۱ء میں ہوئی تو حکیم صاحب کو اس سے بہت صدمہ پہنچا۔ دہلی میں خاندانی مطب کی بقا اور مدرسہ طبیہ کے استحکام کی پوری ذمہ داری حکیم صاحب سے متعلق ہوئی''۔ص:۹

ہمدانی صاحب نے حکیم اجمل خاں صاحب کے منجھلے بھائی حکیم محمد واصل خاں مرحوم کی خدمات کو یکسر نظر انداز کر دیا ہے حال آنکہ حکیم عبدالمجید خان کے انتقال کے بعد یہ ذمہ داریاں حکیم واصل خاں کے سر آن پڑی تھیں۔خود حکیم اجمل خاں لکھتے ہیں:

> ''جناب بھائی صاحب کے بعد میرے منجھلے بھائی حکیم محمد واصل خاں مرحوم نے اس مدرسہ کا چارج لیا اور اس خدمت کو اچھی قابلیت کے ساتھ انجام دیا۔ان کے انتقال کے بعد سے اب تک میں اپنے مرحوم بھائی کی اس یادگار کو ترقی دینے کی کوشش میں مصروف ہوں''۔
>
> (رپورٹ طبی کالج ۱۹۱۹ء۔۱۹۱۸ء)

اسی کے ساتھ ہندوستانی دواخانہ کی فہرست مطبوعہ ۱۹۱۳ء کی درج ذیل عبارت ملاحظہ ہو:

> ''حاذق الملک حکیم محمد عبدالمجید خاں مرحوم کے بعد جناب حکیم محمد واصل خاں مغفور نے اس مشن کو جس پر ہمارے ملک کی طبی ضروریات منحصر ہیں، ترقی دی اور اپنی حذاقت کے کرشمے دکھا کر ہماری طب کی روشنی کو پھیلایا۔ان کے حادثۂ ارتحال کے بعد حاذق الملک حکیم حافظ محمد اجمل خان صاحب بالقابہ نے ہماری طب کی زندگی میں ایک عصر

جدید کا افتتاح کیا''۔ص:۴

نیز مجلہ طبیہ شمارہ نومبر ۱۹۱۵ء جلد ۱۴؍نمبر ۱۲ کا حوالہ گزشتہ عبارات میں پیش کیا جاچکا ہے جو حکیم واصل خاں کی اہم طبی خدمات کی نشاندہی کرتا ہے۔

(۶) ''اور آخر ۱۹۰۵ء میں عازم عراق ہوئے اور بصرہ ہوتے ہوئے بغداد پہنچے پھر نجف اشرف کربلا پہنچے''۔ص:۹

آخر ۱۹۰۵ء سے ماہ دسمبر سمجھا جاتا ہے حال آنکہ حکیم اجمل خاں کا یہ سفر ۹؍جون ۱۹۰۵ء کو تمام ہوجاتا ہے۔مجلہ طبیہ شمارہ مئی ۱۹۰۵ء میں روداد سفر کے ذیل میں مذکور ہے کہ:

''اور آخر ماہ جون تک مع الخیر ہندوستان کی طرف مراجعت فرمائیں گے''۔

اور مجلہ طبیہ شمارہ جولائی ۱۹۰۵ء میں موصوف کی تشریف آوری کا ذکر ان لفظوں میں کیا گیا ہے:

> ''نہایت مسرت کے ساتھ ہم اس امر کا اظہار کرتے ہیں کہ عالی جناب فضیلت مآب حکیم حافظ محمد اجمل خاں صاحب سکریٹری مدرسہ طبیہ دہلی ۹؍جون ۱۹۰۵ء یوم جمعہ کو مع الخیر سفر بغداد شریف سے فارغ ہوکر دہلی میں رونق افروز ہوئے''۔ص:۱

''طبیہ کالج کا منصوبہ'' کے تحت:

> (۷) ''۱۹۱۲ء میں حکیم صاحب نے مدرسہ کو طبیہ کالج کی صورت میں ترقی دینے کا منصوبہ تیار کیا اور اس سلسلے میں انجمن طبیہ کو بورڈ آف ٹرسٹیز کی شکل میں تبدیل کیا''۔ص:۱۰

جہاں تک صحت واقعہ کا تعلق ہے ۱۹۱۱ء میں طبیہ کالج کا منصوبہ تیار ہو چکا تھا بلکہ عملاً اس کی تحریک بھی شروع ہوگئی تھی۔حکیم اجمل خاں نے جو رپورٹ مطبوعہ ۱۹۱۲ء میں پیش کی ہے وہ دراصل ۱۱-۱۹۱۰ء کی روئیداد ہے۔اس روئیداد میں متعدد مقامات پر اس کا ذکر موجود ہے جس سے پتا چلتا ہے کہ یہ منصوبہ ۱۹۱۱ء میں روبہ عمل آچکا تھا۔چنانچہ انجمن طبیہ کی جو رپورٹ از قیام انجمن لغایہ ۱۳؍دسمبر ۱۹۱۱ء شائع ہوئی ہے،اس میں درج ہے کہ حسب ذیل رقوم کے وعدے

طبی کالج کے لئے اب تک ہو چکے ہیں۔

ہز ہائنس نواب صاحب بہادر رام پور	پچاس ہزار روپے
ہز ہائنس نواب صاحب ٹونک	چالیس ہزار روپے
ہز ہائنس بیگم صاحبہ بھوپال	پچیس ہزار روپے
جناب کرنل محمد اسماعیل خاں صاحب سفیر دولت افغانستان	دس ہزار روپے
ہز ہائنس راجہ صاحب بہادر دتیا	دو ہزار روپے
پرنس آف ارکاٹ (مدراس)	پانچ سو روپے

اسی ۱۱-۱۹۱۰ء کی رپورٹ میں ہے کہ:

''اس کالج کا پلین (عمارت مشرقی طرز کی ہے) مکمل ہو چکا ہے'' ۔ص:۱۸

اور جہاں تک انجمن طبیہ کو بورڈ آف ٹرسٹیز کی شکل میں تبدیل کرنے کی بات کہی گئی ہے، یہ کام بھی ۱۹۱۲ء میں نہیں ہوا۔ اس کی مختصر روداد یہ ہے کہ مئی ۱۹۱۰ء میں انجمن طبیہ قائم ہوئی اور ستمبر ۱۹۱۰ء میں مدرسہ طبیہ، مدرسہ طبیہ زنانہ و شفا خانہ زنانہ اور ہندوستانی دواخانہ کو انجمن نے اپنی تحویل میں لے لیا اور بموجب ایکٹ نمبر ۲۱ مصدرہ ۱۸۶۰ء صاحب رجسٹرار جوائنٹ اسٹاک کمیشنر کے دفتر سے اسے رجسٹرڈ کرایا۔ (بحوالہ مطبوعہ دستور العمل بورڈ آف ٹرسٹیز)

''وفات'' کے تحت:

(۸) ''۲۸/۲۹ دسمبر مطابق ۱۳۴۷ھ ریاست رامپور میں شب کو دو بجے وفات ہوئی'' ۔ص:۱۲

عجیب اتفاق ہے کہ یہاں مرحوم کی وفات کی تاریخ سنۂ عیسوی اور سنۂ ہجری سب غلط ہے۔ ہمارے لئے صحت و استناد کا سب سے بڑا پیمانہ حضرت مسیح الملک کی لوحِ مزار ہے جس پر تاریخ رحلت ۲۷/ دسمبر ۱۹۲۷ء کندہ ہے۔ اگر ۲۷/۲۸ دسمبر معرض تحریر میں آئی ہوتی تو تاویل یا توجیہ کی گنجائش تھی مگر ۲۸/۲۹ بالکل خلاف واقعہ ہے۔

نزہۃ الخواطر جلد ہشتم میں بعض مقامات پر مولانا سید ابو الحسن علی ندوی نے ضروری اضافے کیے ہیں انھیں اضافات میں مسیح الملک حکیم اجمل خاں کی تاریخ وفات بھی ہے۔ مولانا

ندوی کے الفاظ یہ ہیں:

"توفی فی الرابع من رجب سنة ست و اربعین و ثلاث ماة و الف فی رامفور"۔

یعنی مسیح الملک کا انتقال ۴/رجب ۱۳۴۶ھ کو بمقام رام پور ہوا۔
اگر اس کی تطبیق سنۂ عیسوی سے کی جائے تو ۲/دسمبر ۱۹۲۷ء ہوتی ہے۔

(مطبوعہ: ماہنامہ برہان دہلی، ۱۹۸۹ء)

قاموس اسماء الادویہ۔ایک جائزہ

چند دنوں سے کونسل کی مطبوعہ طبی لغت ”قاموس اسماء الادویہ“ زیر مطالعہ ہے۔ یہ لغت حکیم اقبال احمد قاسمی (ایسوسی ایٹ پروفیسر طبیہ کالج علی گڑھ) کی تالیف کردہ ہے اور حکیم رضی الاسلام ندوی نے اس کی (Vetting) کی ہے۔(من جملہ دیگراں) واضح ہو کہ کسی لغت کی ترتیب وتدوین میں درج ذیل امور بنیادی حیثیت رکھتے ہیں:

(۱) مادۂ حروف کی املا درست ہو۔

(۲) مادۂ حروف پر (رفع اشتباہ کے لئے) اعراب صحیح لگایا گیا ہو۔

(۳) مادۂ حروف کے معنی/تشریح درست ہوں۔

اور اگر مؤلف نے یہ التزام بھی کیا ہو کہ مادہ کی اصل کیا ہے، سریانی، عبرانی، عربی، فارسی وغیرہ تو اس کی صحت بھی مستند و معتبر ماٰخذ سے کی گئی ہو۔ اس نقطۂ نظر سے جب میں نے متذکرہ کتاب کا مطالعہ کیا تو مجھے ڈھائی سو سے زائد اغلاط نظر آئیں۔

میرا مشورہ ہے کہ کتاب کی فروخت فی الحال روک دی جائے اور چند اہل نظر پر مشتمل ایک پینل تشکیل کر کے تصحیح اغلاط کرالی جائے، پھر صحت نامہ کے انسلاک کے ساتھ کتاب فروخت کرنے کی منظوری دی جائے۔

واضح ہو کہ سطور بالا میں جو کچھ معروض ہوا وہ میری فہم ناقص کا نتیجہ ہے۔ اگر ضرورت داعی ہو تو حکیم سید ظل الرحمن اور راقم الحروف کے لئے ہیڈ کوارٹرس میں نشست کا انتظام کیا جاسکتا ہے۔ یہاں بطور ”نمونہ از خروارے“ کچھ مثالیں حاضر ہیں۔ ان مثالوں سے ظاہر ہے کہ غلطیاں وہ بھی لغت کی تالیف میں کس قدر حیران کن اور افسوس ناک ہیں اور تصحیح کی کس قدر سخت ضرورت ہے۔ ملاحظہ ہو:

بحوالہ مادہ

(سریانی، عبرانی، عربی، فارسی وغیرہا)

فاضل مؤلف ''قاموس اسماء الادویہ'' کے پیش نظر اس لغت کی تالیف کے دوران ابن بیطار کی ''تفسیر کتاب دیاسقوریدوس'' رہی ہے جیسا کہ ''مصادر و مراجع'' ص ۳۱۷ سے ظاہر ہے۔ یہ کتاب ادویہ مفردہ کی تفسیر کا جو مشہور یونانی طبیب دیاسقوریدوس کے مقالات میں مذکور ہیں، قدیم اور معتبر ماخذ ہے۔ جالینوس نے بھی اس پر اعتماد کیا ہے، اس کتاب میں ''مادہ'' کے تحت جن ادویہ مفردہ کو رقم کیا گیا ہے، وہ گنتی کے چند مادوں کے علاوہ سب کے سب یونانی زبان کے الفاظ ہیں، محض چند الفاظ سریانی، عبرانی وغیرہ کے ہیں لیکن اتنا صاف ہے کہ کوئی ایک مادہ بھی عربی زبان کا نہیں ہے۔ اس وقت یہ کتاب میرے پیش نظر ہے۔

اس تمہید کے بعد ''قاموس اسماء الادویہ'' کے درج ذیل مادوں کو ملاحظہ کریں۔ یہ چند مادے محض بطور مثال ہیں:

(ا) اسارون:

اسارون: (ع) تگر (ہ) ایک نبات کی جڑ ہے۔ (قاموس اسماء الادویہ ص:۱۹)

''تفسیر کتاب دیاسقوریدوس'' مقالہ اولیٰ میں نمبر ۶۵ پر یہ لفظ بطور مادہ درج ہے جس سے صاف ظاہر ہے کہ عربی زبان کا لفظ نہیں ہے۔ اب یہ یونانی ہے یا سریانی، اس کو مخزن الادویہ میں شیرازی نے یوں واضح کر دیا ہے:

''اسارون'' بفتح ہمزہ وسین مہملہ والف وبضم رائے مہملہ وسکون واو و نون لغت سریانی است۔ (ص:۱۱۹)

مزید صراحت حکیم اعظم خان نے محیط اعظم میں ان الفاظ میں کر دی ہے۔

''اسارون'' بفتح ہمزہ و گویند کسر آں و فتح سین مہملہ والف وضم رائے مہملہ وسکون واو ونون لغت سریانی است.... گیلانی نوشتہ کہ اسارون درلغت سریانی بمعنی مشاکل در فائدہ آس است، زیرا کہ ''اسا'' درلغت مذکورہ آس را گویند و ''رون'' بمعنی خاصیت و منفعت ست۔ (ج:۱،ص:۱۲۴)

(۲)بلبوس:

بلبوس: (ع) اسقیل (ع) جنگلی پیاز (ہ)

''تفسیر کتاب دیاسقوریدوس'' کے مقالہ ثانیہ میں نمبر ۱۵۲ پر یہ مادہ درج ہے۔

(ص۲۰۱)

محیط اعظم میں ہے:

''بلبوس بروزن ملبوس اسم یونانی است''

(مخزن الادویہ للشیرازی میں ہے:

بلبوس بفتح باءموحدہ وسکون لام وضم باءموحدہ وسکون واووسین مہملہ یونانی ست۔

معجم الشہابی Agricultural and Allied Terminology میں ہے:

''بلبوس من الکلمۃ الیونانیۃ''(ص:۷۲۲)

(۳)جنطیانا:

جُنطیانا: (ع) پکھان بید، جنطیانا رومی (قاموس مذکورص:۷۰)

''تفسیر کتاب دیاسقوریدوس'' مقالہ ثالثہ نمبر ۳ پر یہ مادہ درج ہے۔

مخزن الادویہ للشیرازی میں ہے:

''جِنطیانا'' بکسر جیم وسکون نون وکسر طائے مہملہ وفتح یامثناۃ تحتانیہ والف وفتح نون والف، لغت یونانی است۔

دورحاضر کی معروف معجم ''المنجد فی اللغۃ المعاصرۃ'' میں ہے:

''جنطیانا (ن) کوشاد (یونانیۃ)''۔

یہاں (ن) کا رمز نباتی کے لئے ہے، کوشاد اس کی تفسیر ہے۔

''جنطیانا'' کے حرف اول جیم کے اعراب میں اختلاف ہے۔ ''تفسیر کتاب دیاسقوریدوس'' اور ''المنجد'' میں فتحہ کے ساتھ ہے اور ''مخزن الادویہ'' و ''محیط اعظم'' میں کسرہ سے، لیکن اس کے یونانی الاصل ہونے میں اختلاف نہیں ہے، نہ ہی کسی نے جیم کے ضمہ سے لکھا ہے۔

(۴)غالیون:

غَالِيُوْن: (ع) ایک خوشبودار دوا ہے۔ (ص: ۱۸۵)

"تفسیر کتاب دیاسقور یدوس" مقالہ رابعہ میں یہ مادہ موجود ہے جس سے اس کا عجمی (غیر عربی) ہونا واضح ہے۔

مخزن الادویہ للشیرازی میں ہے:

"غالیون" بفتح غین والف وکسرۂ لام وضم یا وسکون واو ونون لغت یونانی است۔"

(۵) خندروس:

خَنْدَرُوْس: (ع) حنطۂ رومی، مکئی، مکا۔ (ص: ۸۹)

"تفسیر کتاب دیاسقور یدوس" مقالہ ثانیہ ۸۱ پر خندروس کا مادہ ہے۔

معجم الشهابی فی مصطلحات العلوم الزراعیة (Agricultural and allied terminology) میں ہے:

والخندروس من الیونانیة ضرب من الحنطة یستخدم فی انتاج انواع جدیدة (ص: ۶۸۲ تحت Spelt)

المنجد فی اللغه العربیته المعاصرة میں ہے:

خندروس علس، وهو نوع من القمح (یونانیة)

مخزن الادویہ للشیرازی کی عبارت بھی خندروس کے یونانی الاصل ہونے کی مشعر ہے۔ عبارت یہ ہے:

"خندروس بفتح خاوسکون نون وفتح دال وضم راء مہملتین وسکون واو وسین مہملہ وآں راخالاوان نیز وبفارسی ذرہ مکہ وبعربی حنطہ رومیہ ودر تنگابن گندم مکہ وبہندی جوار نامند"۔ (ص: ۴۰۴)

(۶) مالی:

مالی (ف) عسل (ع) شہد (ار)

"تفسیر کتاب دیاسقور یدوس" مقالہ ثانیہ میں نمبر ۲۵ پر مالی بطور مادہ درج ہے، اس لئے اس کے عربی یا فارسی ہونے کا سوال ہی نہیں ہے۔ مخزن الادویہ للشیرازی نے اس کی

وضاحت کر دی ہے ''مالی بیونانی عسل را گویند۔'' (ص: ۲۰۲۴)

حیرت ہے کہ فاضل مؤلف نے شہد کو (ار) کے رمزے سے ظاہر کیا ہے جبکہ یہ فارسی زبان کا لفظ ہے۔

مذکورہ بالا محض چھ نمونے ان مادوں میں سے ہیں جن میں سے ایک مادہ بھی عربی الاصل نہیں ہے بلکہ یہ سارے الفاظ ''تفسیر کتاب دیاسقوریدوس'' میں بطور مادہ درج ہیں اور یہ کتاب فاضل مؤلف کے مطالعہ کی میز کی زینت رہی ہے۔

بحوالہ اعراب وحروف

معاجم میں مادہ کی صحت اعراب کا لحاظ رکھنا ضروری ہے، اسی سے الفاظ کے صحیح تلفظ کا پتہ چلتا ہے۔ عربی معاجم میں اس کا التزام ہوتا ہے (بشرط آنکہ وہ ہندوستانی چھاپہ خانوں کے نہ ہوں)۔ فارسی اور اردو میں اس کا التزام نہیں دیکھا جاتا جو بہر حال نقص ہے لیکن معاجم میں اغلاطِ اعراب کسی طرح بھی قابل قبول نہیں۔ اس جہت سے ''قاموس اسماء الادویہ'' اغلاط اعراب سے بھری پڑی ہے، سو پچاس نہیں، گمان سے بھی زیادہ (ابھی مطالعہ جاری ہے) چند نمونے اس جہت سے بھی:

(ا) بصل:

(ا) بَصْل (ع) پیاز (ار) بَصْل الاکل (ع)

(ب) بَصْل الزعفران (ع) زعفران کی جڑ، زعفران

(ج) بَصْل الزیر (ع) بلبوس، جنگلی پیاز

(د) بَصْل النرجس (ع)

بَصَل باءِ موحدہ وصادِ مہملہ دونوں زبر سے ہے، کسی معتبر لغت سے صاد کے سکون سے ثبوت نہیں پیش کیا جا سکتا اگر کہیں ہے تو وہاں بھی غلط ہے۔ مؤلف نے قرآنی الفاظ (ق ع) کے رمز سے ظاہر کیا ہے مگر یہاں بھول گئے کہ قرآن میں وبَصَلها بفتحتین آیا ہے نیز پیاز اردو نہیں، فارسی زبان کا لفظ ہے۔ محیط اعظم میں ہے:

پیاز بکسر باءِ فارسی و فتح یاء تحتانی والف وسکون زاء معجمہ اسم فارسی است''۔
مؤلف نے بصل کے مادہ میں پیاز کو (ار) لکھا ہے اور پیاز کے مادہ میں (ہ) اور طرفہ یہ کہ یہاں بھی بَصْل ہی ہے (بسکون صاد مہملہ)

(۲) خبث:

(ا) خُبث (ع) میل، جھاڑن

(ب) خبث الحدید (ع) زنگ آہن

(ج) خبث الذھب (ع) سونے کا میل

(د) خبث الرصاص، خبث الاسرب (ع) چرک قلعی

(ہ) خبث الفضۃ (ع) چاندی کا میل

(و) خبث النحاس (ع) چرک تانبہ

عربی زبان میں خُبث بالضم گندگی اور پلیدی کے معنی میں ہے،'' اللھم انی اعوذ بک من الخبث والخبائث'' میں یہی خُبث بالضم کی جمع خُبُث ہے۔
مؤلف نے الف سے واو تک جتنے خبث شمار کرائے ہیں، یہ خبث بفتحتین ہیں۔
محیط اعظم میں تصحیف واقع ہے حالانکہ حکیم اعظم خان نے مخزن الادویہ سامنے رکھ کر محیط تالیف کی ہے، مخزن کی عبارت یہ ہے:۔
''خبث بفتح خا و باء یک نقطہ وثاء مثلثہ جرم اجساد است کہ درحین گداختن از آنہا جدا شود''۔(ص:۳۷۸)

عربی کی ساری متداول لغت میں یہی ہے۔خزائن الادویہ، لغات کشوری، مخزن الجواہر، فیروز اللغات وغیرہا میں بالضم لکھا ہے، یہاں سب سے تسامح واقع ہوا ہے۔اعراب کے نقطۂ نظر سے یہ کتابیں قابل استناد نہیں ہیں۔

(۳) جسار:

جُسار (ع) کیسر، زعفران (ف)

یہ لفظ تو نہ جیم کے پیش سے ہے نہ راء مہملہ سے۔مؤلف سے اعراب اور حرف

دونوں میں غلطی ہوئی ہے۔ اصلا یہ جیم کے کسرہ اور دال مہملہ سے ''جساد'' ہے۔ تمام عربی اور فارسی معاجم میں دیکھا جا سکتا ہے۔ البتہ ''محیط اعظم'' میں جیم کے زبر اور زیر دونوں سے صحیح کہا گیا ہے مگر مؤلف کا مضموم لکھنا غلط ہے۔

(۴) ثوم:

ثوم: (ع) سیر (ف) لہسن (ار)

ثوم کو یوم کے وزن پر حرف اول کے زبر سے لکھا گیا ہے جو غلط ہے۔ کسی معتبر لغت سے اس کی تصدیق نہیں کی جا سکتی۔ یہ ثاء مثلثہ کے پیش سے ہے۔

(۵) تن:

تَن: (ع) ایک قسم کی بڑی مچھلی جو بحر اسود اور بحر شام میں ملتی ہے۔ (ص:۵۹)

''تفسیر کتاب دیاسقوریدوس'' سے مستفاد ہے کہ یہ یونانی الاصل ہے۔

''المنجد فی اللغ العربیۃ المعاصرۃ'' میں صاف درج ہے۔ ''محیط اعظم'' میں بھی یہی مذکور ہے۔ نیز یہ تاء قرشت کے پیش سے تُن ہے نہ کہ زبر سے۔

(۶) پنبہ:

پُنبہ: (ف) روئی (ہ، ار)

پَنبہ باء فارسی کے فتحہ (زبر) سے ہے۔ فارسی کی ہر مستند لغت میں دیکھا جا سکتا ہے۔

بحوالہ عربی و معرب

فاضل مؤلف نے اس امر کا بھی اہتمام کیا ہے کہ کون سا لفظ عربی زبان کا ہے اور کونسا معرب، مگر اس میں بھی بہت سے مقامات پر فاش غلطی واقع ہوئی ہے:

(ا) آملج:

(ا) آملج: (ع) آنولہ (ہ)

(ب) آملہ (ف) آملج (ع) آنولہ (ہ)

فاضل مؤلف آملج کو عربی زبان کا لفظ لکھ رہے ہیں جب کہ یہ آملہ کا معرب ہے،

جیسے ہلیلہ کا معرب ہلیلج اور بلیلہ کا بلیلج۔

(۲) بادیان:

بادیان (ف) سونف (ہ) رازیانج (ع)

جب کہ رازیانج رازیانہ کا معرب ہے۔ (بحوالہ محیط اعظم)

(۳) بادنجان:

باذنجان (ع) بادنجان، بادنگان (ف) بیگن (ہ)

حالانکہ باذنجان بادنگان کا معرب ہے۔

(۴) پستج:

پستج (ع) پستہ

حالانکہ پستج پستہ کا معرب ہے (بحوالہ محیط اعظم)

آملج، ہلیلج، رازیانج کی ساخت الفاظ ہی معرب کی مشعر ہے۔ اس جہت سے کتاب اغلاط کا مجموعہ ہے۔

مجموعۂ تضادات

لغت کی تالیف میں مادۂ لفظ کی اصل بیان کرنے میں تضاد کا ہونا بظاہر نا قابل یقین ہے لیکن ''قاموس اسماء الادویۃ'' نے اسے یقینی بنا دیا ہے۔ اس جہت سے بھی چند نمونے ملاحظہ ہوں، جو حیرت ناک بھی ہیں اور افسوس ناک بھی۔

(۱) اسپغول:

(ا) اسپغول (ہ) بزرقطونا، اسپیوس

(ب) برغونی (ع) اسبغول، اسپغول (ف)

(۲) بلبل

(ا) بلبل (ار) عندلیب (ع)

(ب) شب خواں (ف) بلبل (ف) ہزارداستاں (ف)

(۳)سوسمار:

(ا) گوہ (ہ) سوسمار (ف) ضب (ع)

(ب) سوسمار (ہ) گوہ، ضب (ع)

(۴)بیر بھوٹی:

(ا) بیر بہوٹی (ف) دود المطر (ع) عروسک، کرم مخمل، کاغنہ (ف)

(ب) عروسک (ع) بیر بہوٹی (ہ)

یہ بھی یاد نہ رہا کہ فارسی زبان میں 'ٹ' نہیں ہوتی۔

(۵)زعفران:

(ا) زعفران (ف) کرکم (ع)

(ب) کیسر (ہ) زعفران (ع)

(۶) انگور:

(ا) انگور (ف) عنب (ع)

(ب) عنب (ع) انگور (ہ)

(۷)کلونجی:

(ا) حب السوداء (ع) کلونجی (ف)

(ب) کلونجی (ہ) حبۃ السوداء (ع)

(۸) کرسنہ:

(ا) کرسنہ (ف) مٹر (ار،ہ)

(ب) مٹر (ہ) کرسنہ (ع)

(۹) مقناطیس:

(ا) آہن ربا (ف) مقناطیس (ار)

(ب) مقناطیس (ع) مغنیطس (ی)

(۱۰) اژد:

(ا) اُرد: اُڑد (ہ) مونگ کی دال

(ب) ماش (ہ،ف) مشہور دال ہے۔

(۱۱) آذر بو:

(ا) آذر بو (ع) چوبک اُشنان (ف) عرطنیثا (ی)

(ب) عرطنیثا (ع) آذر بو، چوبک اُشنان

یاللعجب:

(ا) جبلا ہنگ (ع) تخم تر بد، جنگلی تل

(۲) پکھان بید (ف)

(۳) بیر بہوٹی (ف)

اب مؤلف شہیر کو کون قائل کرے کہ نہ تو عربی میں گاف ہے (جبلا ہنگ) نہ فارسی میں کھ ہے (پکھان) نہ ہی فارسی میں ٹ ہے (بہوٹی)۔ یہ ساری لایعنیات کس کے کھاتے میں جائیں گی؟ سرکاری پیسے تو ہر حال میں ضائع ہوئے۔

(۴) ققنس: ایک خیالی پرندہ ہے۔

اگر یہ خیالی پرندہ ہے تو اس کا کون سا حصہ، عضو دوا کے طور پر استعمال میں آتا ہے؟ یاد رہے کتاب کا نام قاموس اسماء الادویہ ہے۔

(۵) عقعق: ایک خوبصورت جانور ہے۔

مزید علیہ

(ا) مؤلف قاموس اسماء الادویہ نے ''رموز و اشارات'' کے عنوان کے تحت ق ع کے رمز سے قرآنی اسمائے ادویہ کا ذکر کیا ہے جو محض گنتی کے ہیں۔ اولاً تو ق ع کے رمز کی ضرورت نہیں تھی اور تھی تو اس کے ساتھ پورا انصاف کیا جانا تھا۔ قرآن کی آیت ''فَادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُخْرِجْ لَنَا مِمَّا تُنْبِتُ الْاَرْضُ مِنْۢ بَقْلِهَا وَقِثَّآئِهَا وَفُوْمِهَا وَعَدَسِهَا وَبَصَلِهَا'' میں صرف فوم کو ع ق کے رمز سے ظاہر کیا گیا ہے۔ قثاء، عدس اور بصل کو ع لکھا گیا ہے۔

حیرت ہے کہ قرآن میں تو بصل بفتحتین ہے مگر مؤلف نے جیسا کہ مذکور ہوا سب کو صاد کے سکون سے لکھا ہے۔

(۲) فار (ع) چوہا (ار) موش (ف)

فارۃ (ع) چوہیا

مؤلف شہیر سے یہاں سخت غلطی سرزد ہوئی ہے۔انھوں نے دونوں (فار، فارۃ) کو مذکر اور مؤنث میں بانٹ دیا ہے جبکہ فارۃ کی تاء، تانیث کی نہیں بلکہ وحدت کی ہے۔صحیح یہ ہے کہ فار جمع ہے اور فارۃ واحد، یعنی فارۃ ایک چوہا اور فار بہت سے چوہے۔

(۳) بیض (ع) بیضہ (ف) انڈا، مرغی کا انڈا، تخم خروس

یہاں بھی مؤلف شہیر سے فاش غلطی ہوئی ہے، بیضہ فارسی زبان کا نہیں، خالص عربی لفظ ہے اور بیض اس کی جمع ہے۔ نیز مرغی کا انڈا تخم خروس نہیں ہے جیسا کہ عبارت سے متبادر ہے، خروس مرغا کو کہتے ہیں جو بانگ دیتا ہے، انڈا نہیں دیتا، البتہ تخم مرغ (مرغی کا انڈا) صحیح ہے۔

مذکورہ بالا معروضات مستند کتب کے حوالے سے درج کیے گئے ہیں۔ جس سے روز روشن کی طرح آشکار ہے کہ اس ''طبی لغت'' کے جامع اور اوراس کی تصحیح (Vetting) کرنے والوں نے نہ تو اس فن شریف کے ساتھ انصاف کیا ہے اور نہ لغت نویسی کے اصول وفرائض کے ساتھ۔

ایک تکلیف دہ امر کی طرف بھی توجہ منعطف کرانا ضروری سمجھتا ہوں۔ وہ یہ کہ بعض قابل رحم اطباء کا یہ وطیرہ رہا ہے کہ ان کے تحریری مواد کی شواہد ونظائر کی روشنی میں گرفت کی گئی تو ایک رٹا رٹایا جواب سننے کو ملا کہ ''ہم نے بھی تو کسی کتاب ہی سے اخذ کیا ہے، اپنی طرف سے تو نہیں لکھا ہے۔'' یہ سراسر ایک غیر علمی جواب ہے اور تحقیقی منہج کے خلاف ہے۔

ضبط معانی میں احتیاط تو الگ بات ہے، ضبط اعراب میں ہمارے قدما نے جس جگر کاوی سے کام لیا ہے، اس کی ایک مثال مولانا حبیب الرحمن خان شیروانی کے ایک مطبوعہ مقالہ سے (جو دار العلوم ندوۃ العلما کے اجلاس سنہ ۱۳۱۴ بمقام میرٹھ میں پڑھا گیا) پیش ہے۔

''ابو عمرو بن العلاء ایک زمانے میں سفاک حجاج بن یوسف کے خوف سے صحرائے عرب میں بھاگے پھرتے تھے۔ادھر تو جان کے

لالے پڑے تھے، اور ادھر اس علامۂ ادب کو یہ تلاش تھی کہ آیا لفظ فرجة (بمعنی کشائش) بالضم ہے یا بالفتح۔ ایک روز اثنائے بادیہ پیمائی ایک قائل کوانھوں نے یہ شعر پڑھتے سنا:

ربماتجزع النفوس من الام رله فرجة کحل العقال

فرجة کواس نے زبر سے ادا کیا۔ یہ شعر پڑھ کر وہ بدوی ابوعمرو کی طرف مخاطب ہوا اور کہا: سنتے ہو! ظالم حجاج مرگیا۔ ابوعمرو کہتے ہیں کہ مجھ کو اس وقت کی یہ تمیز نہ ہوسکی کہ آیا میں کس بات سے زیادہ خوش ہوا، لفظ فرجة کی صحت ہوجانے سے یا اپنے عدوئے جانی کی خبر وفات پانے سے۔"

استفسارات و جوابات

استفسارات......از......مولانا ابرار رضا مصباحی

جوابات......از......ڈاکٹر فضل الرحمن شرر مصباحی

سوال:- پاکستان کے انجینئر مرزا محمد علی نے یوٹیوب (YouTube) پر اپنا اکاؤنٹ کھولا ہے، اس میں انھوں نے اپنی مجالس کی تقریریں اپ لوڈ (Upload) کی ہیں۔ ایک تقریر میں انھوں نے کہا کہ

> ''خواجہ معین الدین چشتی کی خدمت میں ایک شخص بیعت کے ارادے سے آیا تو خواجہ نے فرمایا کہ پہلے تم یوں کلمہ پڑھو تو تمھیں بیعت میں لوں گا لاالٰہَ اِلاَّاللّٰہ چشتی رسولُ اللّٰہِ اس شخص نے ایسا ہی کیا پھر انھوں نے بیعت میں لے لیا''۔

انجینئر محمد علی نے ہشت بہشت کا حوالہ دیا اور کہا کہ ایسا کہنا یا کہلوانا سراسر کفر ہے۔ آپ اس پر اظہارِ خیال فرمائیں۔

جواب:- یہ سوال کسی ایسے دانائے شریعت سے کرنا چاہیے جو بحر طریقت کا بھی شناور ہو۔ آپ کے پیر و مرشد مولانا شاہ عبید الرحمن رشیدی صاحبِ سجادۂ خانقاہ رشیدیہ مجمع البحرین ہیں اُن سے اطمینان بخش جواب حاصل کیا جاسکتا ہے۔

میں یہاں اپنی بے اطمینانی کا ذکر کر کے خود جواب کا طالب ہوں۔

یہ حکایت تصوف کی کئی کتابوں میں ہے، اور ان میں نہ صرف جھول ہے بلکہ خاصا تضاد ہے۔ سبع سنابل میں بھی ہے جو فاضل بریلوی کے مطالعے میں رہی ہے، مگر اس حکایت کے تعلق سے آپ کی کوئی تحریر میری نظر سے نہیں گزری۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا، یہ حکایت تصوف کی کئی کتابوں میں مذکور ہے مگر اس قدر تعارض ہے کہ ذہن اس کے الحاقی نہ ہونے کو قبول نہیں کرتا۔ بعینہٖ یہی حکایت ہشت بہشت میں حضرت شبلی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے منسوب ہے۔

سبع سنابل میں یہ حکایت حضرت خواجہ یوسف چشتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے منسوب ہے۔عبارت ملاحظہ ہو:

''درفوائد السالکین آوردہ است کہ خواجہ معین الدین چشتی فرمود قدس سرہ کہ من بخدمت شیخ یوسف چشتی حاضر بودم کہ مردے بہ نیت بیعت درآمد سر درقدم خواجہ نہاد وگفت بہ بیعت آمدم خواجہ درحالتے بود و گفت اگر بگوئی لا الہَ اِلاّ اللہ چشتی رسولُ اللہ ترا مرید بگیرم چوں آں مرد راسخ وصادق بود برفور اقرار کرد خواجہ اورا بہ بیعت دست داد و بہ نعمت مشرف گردانید بعدہٗ گفت بشنو من کیستم وچہ باشم یکے از کمینہ بندگان درگاہ رسول ہستم وکلمہ ہماں است اما برائے کمالیت تو وآزمایش اعتقاد وصدق تو امتحان کردم''۔(سبع سنابل، مطبع نظامی ۱۳۰۱ھ)

یہ حکایت سبع سنابل میں فوائد السالکین کے حوالے سے خواجہ یوسف چشتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے منسوب ہے، ظاہر ہے فوائد السالکین کا یہ نسخہ ۱۳۰۱ھ سے پہلے کا ہے جس کا حوالہ سبع سنابل ۱۳۰۱ھ میں ہے۔یہی حکایت فوائد السالکین (فارسی) کے ایک دوسرے نسخے میں ہے جس کا سنہ طباعت ۱۳۱۱ھ ہے، اس میں یہ حکایت خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ سے منسوب ہے۔ملاحظہ ہو:

''آں گاہ ہم دریں محل فرمود کہ من وقتے بخدمت شیخ معین الدین حاضر بودم واہل صفہ نیز حاضر بودند حکایت اولیا می رفت دریں میان مردے از بیروں بیامد و بہ نیت بیعت سر درقدم نہاد خواجہ فرمود بنشیں بنشست گفت کہ من خدمت شیخ بہ جہت آں آمدہ ام تا مرید شوم وخدمت شیخ دروقت بود فرمود ہرچہ من ترا بگویم بکنی و بجا آوری پس بدیں شرط ترا مرید بگیرم گفت بداں چہ فرمان شود گفت چناں کہ توکلمہ بگوئی لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہُ مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللہِ اگر یک بار بدیں طریق بگو لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہُ چشتِی رَسُولُ اللہِ چوں کہ راسخ بود برفور بگفت خواجہ اورا بیعت کرد وخلعت ونعمت داد و بشرف بیعت مشرف

گردانید آں گاہ مرد را گفت بشنو من کہ ترا گفتم کہ کلمہ بریں نوع بگو از برائے عقیدت ترا فرمودہ ام و الاّ من کیستم و کدامم یکے از کم ترین بندگان محمد رسول اللہ ام"۔ (فوائد السالکین ۱۳۱۱ھ)

اس نسخۂ فوائد السالکین کا اردو ترجمہ جو لاہور سے شائع ہوا ہے، اس میں اس حکایت کا ترجمہ یہ ہے:

"اسی موقع کے مناسب آپ نے فرمایا کہ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ میں اور بہت سے اہل صفا شیخ معین الدین رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر تھے اور اولیاء اللہ کے بارے میں ذکر ہو رہا تھا۔ اسی اثنا میں ایک شخص باہر سے آیا اور بیعت ہونے کی نیت سے خواجہ صاحب کے قدموں میں سر رکھ دیا۔ آپ نے فرمایا بیٹھ جا۔ وہ بیٹھ گیا اور اس نے عرض کی کہ میں آپ کی خدمت میں مرید ہونے کے واسطے آیا ہوں۔ شیخ صاحب اس وقت اپنی خاص حالت میں تھے۔ آپ نے فرمایا کہ جو کچھ میں تجھے کہتا ہوں، وہ کہو اور بجالاؤ تب مرید کروں گا۔ اس نے عرض کی کہ جو آپ فرمائیں، میں بجالانے کو تیار ہوں۔ آپ نے فرمایا کہ تو کلمہ کس طرح پڑھتا ہے؟ اس نے کہا لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ آپ نے فرمایا یوں کہو لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ چِشْتِیِ رَّسُوْلُ اللّٰهِ اس نے اسی طرح کہا۔ خواجہ صاحب نے اسے بیعت کر لیا اور خلعت و نعمت دی اور بیعت کے شرف سے مشرف کیا پھر اس شخص کو فرمایا کہ سُن! میں نے تجھے جو کہا تھا کہ کلمہ اس طرح پڑھو۔ یہ صرف تیرا عقیدہ آزمانے کی خاطر کہا تھا ورنہ میں کون ہوں؟ میں تو ایک ادنیٰ سا غلام محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہوں"۔

(فوائد السالکین اردو ترجمہ، ناشر: شبیر برادرز، لاہور)

یہاں چند باتیں غور طلب ہیں۔ پہلے حضرت میر عبد الواحد بلگرامی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی

سبع سنابل کی حکایت کے تعلق سے:

سنابل میں یہ حکایت فوائد السالکین کے حوالے سے ہے، اس حکایت میں مرید ہونے کی نیت سے آنے والا شخص خواجہ یوسف چشتی کی خدمت میں حاضر ہوا۔ خواجہ معین الدین چشتی اس مجلس خیر میں موجود تھے۔

سنابل میں خواجہ یوسف چشتی کا نام آیا ہے۔ یہ بزرگ غالباً حضرت خواجہ ابو یوسف چشتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ ہیں جن کا نام ایک شعر میں یوسف چشتی بھی نظم ہوا ہے۔ سلسلۂ چشتیہ کی ترتیب کے خیال سے چند شعر تحریر کیے جاتے ہیں ؎

پس آں خرقہ بو احمد چشت یافت
کہ حورش برشت و ملایک ببافت
محمد کہ او نیز از چشت بود
ز سودائے خوش کرد آں مایہ سود
وزو یوسف آں پیر چشتی سرشت
کہ بود ست مودود و مقبول چشت
وزو یافت آں اشرف الدین شریف
کہ شد زندگی نسبت آں حریف
وزو یافت ہارونی عثمان بہر
در آورد آں خلعت خوش بہ بر
وزو در بر آں خرقہ عہد ے بعید
معین الدین آں پیر سجزی کشید

اس سلسلۂ چشتیہ میں خواجہ ناصر الدین ابو یوسف چشتی اور خواجہ معین الدین چشتی کے درمیان تین واسطے ہیں۔ خواجہ یوسف چشتی کی ولادت ۳۷۵ھ میں ہوئی اور وصال ۴۵۹ھ

میں ہوا، اور خواجہ معین الدین چشتی کی ولادت ۵۳۷ھ میں ہوئی اور وصال ۶۳۲ھ(۱) میں ہوا۔ اگر ان دونوں بزرگوں کے سال ولادت اور سال وفات کے اختلاف کو مدنظر رکھا جائے تو خواجہ ابو یوسف چشتی کی وفات اور خواجہ معین الدین چشتی کی ولادت کے درمیان بہ اختلاف روایت ۷۵ / یا ۷۸ / سال کا فرق ہے۔ اس صورت میں سبع سنابل کی عبارت "خواجہ معین الدین چشتی فرمود قدس سرہ کہ من بخدمت شیخ یوسف چشتی حاضر بودم" ساقط الاعتبار ہو جائے گی اور الحاقی یوں ہوگی کہ خود سنابل کے سنبلۂ ہفتم میں خواجہ ناصر الدین ابو یوسف چشتی کے بعد سلسلہ بہ سلسلہ خواجہ معین الدین چشتی کا نام درمیان کے تین واسطوں کے ساتھ آیا ہے، پھر حضرت میر سے یہ سہو کیوں کر ہو سکتا ہے۔

سلسلۂ چشتیہ میں خواجہ یوسف چشتی نام سے کسی اور بزرگ کا نام میری نظر سے نہیں گزرا، جس کے لئے خواجہ معین الدین چشتی فرمائیں کہ

"من بخدمت شیخ یوسف چشتی حاضر بودم"۔

فوائد السالکین کے دوسرے فارسی نسخے میں یہ حکایت براہ راست حضرت خواجہ معین الدین چشتی سے منسوب ہے۔ اس حکایت میں "درحالتے بود" نہیں ہے۔ ممکن ہے "دروقت خود بود" نسخ کتابت ہو یا اسی طرح کے جملہ کا کچھ "درحالتے بود" سے ملتا جلتا مفہوم ہو کیوں کہ اس نسخہ کے مترجم نے اپنے اردو ترجمہ میں اس کا ترجمہ "ایک خاص حالت" کیا ہے۔ فوائد السالکین کے دونوں نسخوں میں منسوب الیہ کے تضاد کی وجہ سے ذہن اس کے الحاقی نہ ہونے کو قبول نہیں کرتا، جب کہ ہشت بہشت میں بعینہٖ یہی حکایت حضرت شبلی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے منسوب ہے۔

سبع سنابل کی عبارت (لَاإِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ چِشْتِي رَسُولُ اللّٰهِ) پر اعتراض کے جواب میں ہمارے بعض اولیائے امت نے لکھا ہے کہ "یہ غیر شرعی نہیں ہے۔ اس میں صاف تصریح ہے کہ خواجہ پر کیف طاری تھا۔ اس سے صاف اشارہ ہے کہ حضرت خواجہ اس وقت کسی اور حالت میں

---

(۱) خواجہ غریب نواز کے سنہ وفات میں اختلاف ہے بعض تاریخ نگاروں نے ۶۳۶ھ اور بعض نے ۶۳۷ھ بھی لکھا ہے۔

تھے جس سے ظاہر ہے کہ یہ حالت سکر کی حالت تھی اور صوفیۂ کرام کا اس بات پر اجماع ہے کہ حالت سکر حالت تکلیف نہیں''۔(۱)

لیکن اس بندۂ آثم کو اس جواب میں تردد ہے۔واقعہ کا تسلسل ملاحظہ کیجیے، ایک شخص آیا، سوال ہوا کیسے آئے عرض کیا بیعت کے لیے ارشاد ہوا پہلے کہو لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا اللہُ چِشْتِی رَسُولُ اللہِ تو بیعت میں لوں گا۔شخص مذکور فوراً حکم بجالایا، پھر بیعت میں لیا گیا اور خلعت و نعمت سے نوازا گیا۔پھر ارشاد ہوا کہ میں نے تمھاری خالص الاعتقادی کا امتحان لیا ہے، ورنہ کلمہ وہی ہے (یعنی لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا اللہُ مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللہِ) مقام توجہ ہے کہ باہر سے آئے ہوئے شخص سے سوال کہ ''کیسے آئے'' سے لے کر ''تمھاری خالص الاعتقادی کا امتحان'' تک کے پورے دورانیے میں عرض و ارشاد کا تسلسل پورے ہوش و حواس میں مفہوم ہوتا ہے اس لئے ''در حالتے بود'' کا کچھ بھی مفہوم ہو لیکن سکر کی حالت کو یہ جملہ ظاہر کرتا نظر نہیں آتا۔

فوائد السالکین کے دوسرے نسخے کی عبارت پر میں نے غور کیا مگر تشویش میں کمی نہیں ہوئی۔اول تو فوائد السالکین کے پچھلے نسخے میں جس کا حوالہ سبع سنابل ۱۳۰۱ھ میں ہے اور اس سے پہلے جو سبع سنابل کا نسخہ ۱۲۹۹ھ کا ہے، جس کا حوالہ پروفیسر خلیق احمد نظامی نے تاریخ مشائخ چشت کے صفحہ ۲۳۸ کے حاشیے میں بیعت کی تعریف کے ذیل میں دیا ہے۔جب دونوں نسخوں میں فوائد السالکین کے حوالے سے اس حکایت کی نسبت حضرت خواجہ یوسف چشتی کی طرف کی گئی ہے تو ۱۳۱۱ھ کی فوائد السالکین میں یہ نسبت کیوں کر بدل گئی۔ دوسرے یہ کہ میں نے ۱۳۱۱ھ کی مطبوعہ فوائد السالکین کی عبارت کا بغور مطالعہ کیا، مجھے عبارت میں جھول نظر آیا۔اللہ تعالیٰ میری اس کاوش کے اخلاص کو قبول فرمائے۔ یہ بزرگوں کی عبارت پر نقد نہیں ہے بلکہ بزرگوں سے عبارت کی نسبت پر اظہار خیال ہے۔

(الف) فوائد السالکین ۱۳۱۱ھ میں ''خواجہ در حالتے بود'' نہیں ہے۔ بلکہ اس مقام پر ''خواجہ در وقت بود'' ہے۔ممکن ہے اس کا مفہوم ''در حالتے بود'' سے ملتا جلتا ہو مگر ظاہر عبارت سے

---

(۱) ترجمہ سبع سنابل مطبوعہ رضوی کتاب گھر بھیونڈی۔ترجمہ کے اختتام کے بعد چند سوالات ہیں جن کے جواب مفتی جلال الدین امجدی علیہ الرحمہ نے دیے ہیں جیسا کہ مجھے حافظ محمد قمر الدین رضوی مالک رضوی کتاب گھر نے بتایا۔۱۲

یہ ظاہر نہیں ہے۔

(ب) خواجہ اجمیری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا اس نو وارد سے کہنا کہ میں اس وقت تم کو مرید کروں گا کہ پہلے تم وہ کہو جو میں کہوں گا تب مرید کروں گا۔ یہ جملہ حضرت خواجہ اجمیری کی قدر و منزلت اور بارگاہ خدا و رسول میں آپ کی فروتنی کے پیش نظر فروتر نظر آتا ہے۔ یہاں بھی میں اپنا مذکورہ قول دہراؤں گا کہ ذہن اس حکایت کے الحاقی نہ ہونے کو قبول نہیں کرتا۔ مگر جیسا کہ میں نے ابتدائے سطور میں عرض کیا ہے، یہ اہل علم سے استفسار ہے اور جواب مطلوب ہے۔

احقر نے درج ذیل مکتوب کے ذریعے حضرت مولانا مفتی محمد نظام الدین صاحب مفتی الجامعۃ الاشرفیہ سے استفسار کیا تو یہ جواب عنایت ہوا:

حضرت مفتی صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

معروض خدمت کہ ایک شخص حضرت یوسف چشتی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں بیعت کے لئے آیا ''خواجہ درحالتے بود''۔ ارشاد ہوا کہ تم ''لا الٰہ الا اللہ چشتی رسول اللہ'' کہو تو تم کو بیعت میں لے لوں گا۔ اس نے پڑھ لیا۔ خواجہ نے فرمایا: سنو! کلمہ وہی ہے (لا الٰہ الا اللہ مُحَمَّدٌ رَسُولُ اللہ) میں تمھارا امتحان لے رہا تھا (مفہوم عبارت)۔

اس قول کی توجیہ یا تاویل کیا ہوگی؟

شرر مصباحی، ۱۸/مئی ۲۰۲۰ء

جواب

مخلص نواز

وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

ثم السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

اولیاء اللہ کے کچھ کلمات متشابہات سے ہوتے ہیں، جن کا معنی مراد ہم جیسے لوگ نہیں سمجھ سکتے۔ اس طرح کے کلمات ان کے خاص اسرار سے ہوتے ہیں، جن کی مراد اسی پایہ کے لوگ سمجھتے ہیں۔ عموماً اس طرح کے پراسرار کلمات ان کی زبان پاک سے اس وقت صادر ہوتے ہیں، جب وہ قربِ خداوندی کی خاص حالت میں ہوتے ہیں۔ ''درحالتے بود'' سے اسی کی طرف

اشارہ ہے۔اس حالت میں بھی ان کی باتیں ہوش مندوں کی طرح ہوتی ہیں۔دنیا سمجھتی ہے کہ وہ ہوش میں ہیں حالاں کہ اس وقت وہ قرب ربانی کی خاص کیفیت سے سرشار اور مدہوش ہوا کرتے ہیں۔یہ حضرات قدس دیوان گانِ عشق و معرفت ہوتے ہیں اور اس وجہ سے وہ شریعت کے قلم رو سے باہر ہوتے ہیں جیسے دنیا کا دیوانہ شریعت کے قلم رو سے باہر ہوتا ہے۔ہم نے کچھ دیوانوں سے باتیں کی ہیں اور ان کی باتیں سنی ہیں۔کبھی کبھی وہ بہت ٹھکانے کی باتیں کرتے ہیں جو حقیقت میں ان کے لاشعور کی باتیں ہوتی ہیں۔یہ حضرات بھی جب ''فکنت **سمعه الذی یسمع به**'' کے مقام قرب پر فائز ہوتے ہیں تو لاشعور میں بظاہر شعور کے مشابہ باتیں کرتے ہیں۔دنیا ان کی غیر مخلوط اور بامعنی باتوں کو سن کر اہل شعور سے سمجھتی ہے حالاں کہ وہ باتیں لاشعور کی ہوتی ہیں۔ہم کبھی کبھی کم سن بچوں سے بھی کچھ شعور کی باتیں سن لیا کرتے ہیں اگرچہ نادراً سہی حالاں کہ ابھی ان کا شعور بیدار نہیں ہوتا۔

متشابہات ایسے کلمات کو کہتے ہیں جن کا ظاہری معنی اہل زبان کے نزدیک متعین ہوتا ہے،مگر قائل کی مراد اس سے کچھ اور ہوتی ہے،جو اس کے اسرار سے ہوتی ہے۔ایسے کلمات وہ اپنے خاصان معرفت سے کرتا ہے،جو رمز شناس ہوتے ہیں۔آج کل کی بول چال میں کوڈ ورڈ (Code Word) کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے جس کے ظاہری معنی کچھ بھی ہوں مگر معنی مراد قائل اور مخاطب جانتے ہیں۔بلاغت کی اصطلاح میں ایک خاص لفظ''توریہ''بولا جاتا ہے،جس کا معنی قریب کچھ اور معنی بعید کچھ اور ہوتا ہے۔وہ بھی اسی نوع اسرار کی بالکل ابتدائی قسم ہے جسے اس نوع اسرار کا الف ب ج کہا جا سکتا ہے،اور کوڈ ورڈ (Code Word) کو اس کی دوسری نوع کہنا چاہیے جس کا معنی مراد چند واقفانِ اسرار کے سوا کوئی نہیں جانتا۔اولیاء اللہ کے کلمات معرفت کو اس مثال کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کرنا چاہیے۔ان کے متشابہات دوسرے خاصان خدا کے لیے ایک طرح کا کلمہ سر ہیں،جن کے معنی مراد وہ باہم خوب سمجھتے ہیں۔اس سے ایک درجہ اوپر چلیے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کلمات میں بھی متشابہات ملیں گے اور متشابہات کا آخری درجہ خدائے ذوالجلال کے کلمات متشابہات کا ہے۔جس کے معنی مراد تک بس رسول مرتضیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو رسائی ہوتی ہے یا جس پر آپ کا کرم خاص ہو جائے۔اس طرح کلمات

اسرار کے کئی درجات سامنے آئے۔

- خدائے پاک کے کلمات اسرار، جنھیں متشابہات کہا جاتا ہے۔
- رسول مرتضیٰ کے کلمات اسرار، انھیں بھی متشابہات کہنا چاہیے۔
- خاصان خدا کے کلمات اسرار تعبیر کی آسانی کے لیے ہم انھیں بھی متشابہات کہتے ہیں۔
- دانش وروں کے کلمات اسرار جنھیں کوڈ ورڈ (Code Word) کہا جاتا ہے۔ یہ

آخری درجہ آسان سے آسان تر ہے پھر بھی عامۂ ناس کی دست رس سے باہر ہے، اوراس کے اوپر کا ہر درجہ پہلے سے زیادہ عسیر الفہم اور دشوار تر ہے۔ ان کی مراد پر آگاہی بس اسی کو ہوسکتی ہے جو قائل کے رمز شناس ہوں۔

حضرت خواجہ یوسف چشتی رحمۃ اللہ تعالی علیہ سے حالت قرب ربانی میں کوئی صاحب مرید ہونے کے لیے آئے۔ ظاہر یہی ہے کہ وہ بھی رمز شناس تھے۔ حالت ظاہری میں اہل ظاہر مرید ہوتے ہیں اور حالت قرب میں اہل قرب۔ مرید ہونے والے بزرگ بھی حالت قرب میں ہی تھے، مگر قریب و اقرب کا فرق تھا۔ مرید ہونے سے مقصود منزل اقربیت تک رسائی تھی، یہ بیعت ارشاد نہیں تھی بیعت ایصال تھی۔ اس لیے مراد نے مرید کا امتحان لیا کہ رمز شناس ہو تو قریب آئے ورنہ صحبت کے لائق نہیں۔ وہ امتحان میں کامیاب رہے جو مرید ہو کر مراد ہوئے۔ رسول کا معنی قاصد ہوتا ہے۔ ممکن ہے ان کی مراد اس کلمہ سر سے قاصد بواسطہ ہو مگر ہم اہل ظاہر اپنے اشباہ کو اس کی اجازت نہیں دیتے۔ جو لوگ شریعت کے قلم رو سے باہر ہیں، ان پر ایسے لوگوں کو قیاس نہیں کیا جاسکتا جن پر شریعت کا قلم جاری و ساری ہے۔ قیاس کے لیے علت مشترکہ چاہیے، مگر یہاں اشتراک الگ چیز ہے۔ فی الواقع نسبت اشتراک بھی نہیں۔ چہ نسبت خاک را با عالم پاک۔

میان عاشق و معشوق رمز یست
کراماً کاتبیں را ہم خبر نیست

آج میں بھی ایک حالت میں ہوں بیمار اور سخت کمزور۔ سوچا تھا آج سوال و جواب سے الگ رہ کر کچھ ذہنی سکون حاصل کرلوں۔ مگر آپ کا سوال سن کر یہ محسوس ہوا کہ ذہنی سکون اس کے جواب میں ہے۔ تو چند سطور اللہ کے فضل پر بھروسہ کر کے املا کرادیے۔ ایک ظاہر بیں اہل باطن

کے کلام کی تشریح کیا کر سکتا ہے۔ مگر حکم تھا، کچھ عرض کر دیا۔ حق یہ ہے کہ

ذوق ایں مے نہ شناسی بخدا تا نہ چشی

محمد نظام الدین رضوی

صدر مفتی جامعہ اشرفیہ مبارکپور

شب 25 / رمضان 1441ھ

18 / مئی 2020ء دوشنبہ

سوال:- مصباحی کے لاحقے کا پس منظر کیا ہے اور اس کو سب سے پہلے کس نے اپنے نام کا لاحقہ بنایا؟

جواب:- موجودہ ادارہ الجامعۃ الاشرفیہ کا اولیں نام ''مصباح العلوم'' تھا جو محلہ پرانی بستی، مبارک پور میں واقع تھا، پھر جب اس کی تعمیر جدید بمقام گولہ بازار رئیس قصبہ عالی جناب شیخ محمد امین انصاری کے گھرانے کی موقوفہ زمین پر ہوئی اور اس کا سنگ بنیاد شیخ المشائخ حضور اشرفی میاں رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے رکھا تو اس کا نام ''دار العلوم اہل سنت اشرفیہ مصباح العلوم'' قرار پایا جس کا تاریخی نام ''باغ فردوس (۱۳۵۳ھ) ہے۔ اسی نام سے ادارہ کا دستور اساسی اور میمورنڈم آف ایسوسی ایشن رجسٹرڈ ہے۔

دار العلوم اشرفیہ کے دفتر انچارج مولانا علی احمد قریشی مبارک پوری علیہ الرحمہ جو علم الفرائض میں اپنی مثال آپ تھے، وہ اپنے نام کے ساتھ ''مبارک'' لکھتے تھے۔
ایک دن میں نے پوچھا کہ آپ ''مبارک'' کیوں لکھتے ہیں تو انھوں نے کہا کہ جس طرح مسلم یونیورسٹی علی گڑھ والے ''علیگ'' لکھتے ہیں۔ یہ غالباً ۱۹۵۸ء کی بات ہے۔ آج بھی اشرفیہ کے پرانے ریکارڈ، بالخصوص رجسٹر قبض الوصول اور رجسٹر حاضری میں ''علی احمد مبارک'' دیکھا جاسکتا ہے۔ لیکن یہ لاحقہ انھیں تک محدود رہا۔ انھوں نے اس کی ترویج نہیں کی۔ میرے پوچھنے پر انھوں نے اس کا ذکر کیا۔ پھر غالباً ۱۹۵۸ء میں ''مصباحی'' لاحقہ کی ابتدا میری یادداشت کے مطابق شیخ الاسلام حضرت مولانا سید محمد مدنی میاں حفظہ اللہ تعالیٰ نے کی جو اس بندۂ آثم سے ایک جماعت اوپر کے طالب علم تھے۔ اسی قدیمی نام ''مصباح العلوم'' کی نسبت سے یہ

مصباحی کا لاحقہ ہے۔

سوال:- اس لاحقہ کی نسبت حضرت بحر العلوم مفتی عبد المنان علیہ الرحمہ نے اپنے فرزند مولانا محمد احمد مصباحی کی طرف کی ہے؟

جواب:- ۱۹۵۹ء میں مولانا محمد احمد مبارک پوری دس برس کے تھے اور ۱۹۶۱ء میں بارہ برس کے۔ اس عمر میں وہ دار العلوم اشرفیہ میں کس درجے کے طالب علم رہے ہوں گے اور ان کا فکری شعور اور اختراعی ذہن کتنا بالغ رہا ہوگا، یہ سب پر ظاہر ہے۔

حضرت بحر العلوم علیہ الرحمہ میرے اساتذہ میں تھے۔ خارج اوقات میں بھی میں نے اُن سے بیش از بیش استفادہ کیا ہے، ممکن ہے ان کے پاس مولانا محمد احمد کی دس برس سے کم عمر میں لکھی گئی کوئی تحریر ہو جس میں انھوں نے اپنے نام کے ساتھ مصباحی جوڑا ہو، مگر اس کا کوئی دستاویزی ثبوت بھی تو ہو۔

سوال:- اگر کوئی دستاویزی ثبوت نہ ہو تو کیا حضرت کے قول پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا؟

جواب:- آگے حد ادب۔

سوال:- میں نے کہیں آپ کی ایک غیر مطبوعہ کتاب **الدلائل الواضحة فی من جاء بالسورة الفاتحة** کے بارے میں پڑھا تھا، اس کی طباعت کا سامان اب تک کیوں نہیں ہوا؟ اس حوالے سے کچھ فرمائیں؟

جواب:- اس رسالے کے شائع نہ ہونے کا مجھے افسوس ہے جس کا ذکر میں آخر میں کروں گا۔ پہلے یہ دلچسپ واقعہ سن لیجیے!

مولانا پالن حقانی نے مولوی گنج لکھنؤ کے ایک جلسے میں بیان کیا تھا کہ سورۂ فاتحہ اور سورۂ بقرۃ کی آخری آیات حضرت جبریل علیہ السلام کے ذریعے نازل نہیں ہوئیں بلکہ ایک اور فرشتہ یہ سورہ اور آیات لے کر خدمت اقدس صلی اللہ علیہ وسلم میں حاضر ہوا۔ حضرت جبریل اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر تھے، اور یہ کہ اس کا تفصیلی بیان آئندہ چھوائی

ٹولہ کے جلسے میں کروں گا۔

مجھے خبر ہوئی تو میں نے حکیم عبدالقوی دریابادی سے رابطہ کیا جو ہمارے کالج کی مینجنگ کمیٹی کے نائب صدر تھے (جو مولانا عبدالماجد دریابادی کے بھانجے یا بھتیجے تھے)۔ انھوں نے کہا کہ میں پوچھ کر بتاؤں گا، مگر دوبارہ ان سے ملاقات نہ کر سکا۔ میرے سامنے قرآن کریم کی آیت "ونزل به الروح الامین" تھی۔ میں نے سوچا کہ اس آیت کے تحت ممکن ہے تفسیر میں کچھ لکھا ہو۔ اتنے میں وہ دن آ گیا اور مولانا پالن حقانی جھوائی ٹولہ کے اپنے ایک عقیدت کیش کے یہاں فروکش ہو گئے۔ میں اپنی تشویش لے کر پہنچا۔ وہاں ندوہ کے چند طلبہ بیٹھے ہوئے تھے ۔شاید نیاز حاصل کرنے آئے تھے۔ میں نے اجازت حاصل کر کے سوال کیا کہ آپ نے مولوی گنج میں درمیان تقریر یہ کہا تھا کہ سورۂ فاتحہ اور سورۂ بقرۃ کی آخری آیات حضرت جبریل علیہ السلام کے ذریعے نازل نہیں ہوئی تھیں۔ اس کا شہر میں اسی دن سے چرچا ہے۔ مفسرین نے تو صاف صاف لکھا ہے کہ پورا قرآن مقدس حضرت جبریل علیہ السلام کے ذریعے نازل ہوا ہے۔ تو انھوں نے کہا کہ مفسرین کی بات مانوں یا حدیث کی، پھر انھوں نے کہا کہ نسائی شریف میں یہ حدیث موجود ہے، جا کر دیکھ لیجیے۔ اس میں لکھا ہے کہ حضرت جبریل علیہ السلام خدمت اقدس میں حاضر تھے یکا یک آسمان کا ایک دروازہ کھلا اور وہاں سے ایک فرشتہ آیا۔ اس نے عرض کیا کہ یارسول اللہ! اللہ تعالیٰ نے آپ کو سورۂ فاتحہ اور سورۂ بقرہ کی آخری آیات عطا فرمائی ہیں یہ وہ آیات ہیں جو آپ سے پہلے نازل نہیں ہوئیں، نہ توراۃ میں نہ انجیل میں۔

میں نے کہا کہ اس فرشتہ نے سورۂ فاتحہ اور سورۂ بقرہ کی آخری آیات کا ذکر کیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیات نازل ہو چکی تھیں، ورنہ وہ فرشتہ سورۂ فاتحہ اور سورۂ بقرہ کی آخری آیات تلاوت کرتا۔ انھوں نے کہا کہ مجھ سے بحث نہ کیجیے۔ نسائی شریف میں جا کر دیکھ لیجیے۔ وہاں سے اُٹھ کر میں اپنے روم پر آیا پھر امیر الدولہ لائبریری قیصر باغ گیا۔ نسائی شریف میں حدیث نظر آئی۔ اس حدیث کا مفہوم یہ تھا:

وہ فرشتہ سورۂ فاتحہ اور خواتیم سورۂ بقرہ کی فضیلت عرض کرنے حاضر ہوا تھا، سورۂ فاتحہ اور خواتیم سورۂ بقرہ کے لئے "أنزِلَتْ" کا لفظ تھا یعنی وہ نازل شدہ آیات کی فضیلت کی بشارت

دینے حاضر ہوا تھا۔

اس کے بعد میں اپنے مبارک پور کے مولانا مسرور حسن (بکھری) کے یہاں مدرسۃ الواعظین گیا۔ اُن سے کہا کہ آپ کے مذہب کے مفسرین نے ''ونزل به الروح الامین'' کے تعلق سے کیا بیان کیا ہے۔ انھوں نے میری پوری مدد کی۔ وہاں سے ضروری مواد حاصل کر کے ندوۃ العلما گیا۔ وہاں کی لائبریری سے استفادہ کیا اور ایک رسالہ ''الدلائل الواضحة فی من جاء بالسورۃ الفاتحۃ'' تالیف کیا۔

رسالہ مکمل کر کے فرنگی محل کے سب سے بزرگ عالم دین حضرت مولانا مفتی محمد عتیق علیہ الرحمہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ رسالہ پیش کیا اور مولانا پالن حقانی کے تعلق سے سارا ماجرا سنایا۔ انھوں نے کہا کہ کل آ کر اس رسالے کے تعلق سے میری تحریر لے لیجیے گا۔ دوسرے دن پہنچا تو انھوں نے ایک صفحہ پر مشتمل تحریر عطا کی۔ یہ تحریر میرے پورے رسالے پر بھاری تھی۔ ایسے دلائل وشواہد سے پُر تھی جو علمائے فرنگی محل مولانا عبدالحلیم فرنگی محلی اور مولانا عبدالحئ فرنگی محلی کے سچے جانشیں ہونے کی یاد دلاتی تھی۔

افسوس کہ یہ تحریر جو ایک صفحے پر مشتمل تھی، گم ہوگئی۔ تلاشِ بسیار کے بعد بھی نہ ملی اور اس کے بغیر میں یہ رسالہ بالکل ادھورا سمجھ بیٹھا، یہی وجہ ہے کہ یہ رسالہ طباعت سے محروم رہا۔

سوال:- ٹائی کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے۔ یہ جائز ہے یا ناجائز؟

جواب:- میں نے اشرفیہ کی طالب علمی کے زمانے میں نائب شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالرؤف بلیاوی علیہ الرحمہ سے ٹائی کے استعمال کے جواز وعدم جواز کے بارے میں دریافت کیا تھا۔ انھوں نے فرمایا تھا کہ اب یہ کسی قوم کا شعار نہیں رہ گیا ہے بلکہ فیشن میں داخل ہے اور **من تشبه بقوم فهو منهم** کے دائرے میں نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کا مفہوم یہی ہے کہ اس کا استعمال ناجائز نہیں ہے۔

۱۹۹۲ء میں جشن صد سالہ حضور مفتی اعظم ہند کے دوسرے دن کے اجلاس میں میں بھی شریک تھا۔ اسٹیج پر تقریباً پچاس علما تشریف فرما تھے۔ ایک مقرر کی ولولہ انگیز تقریر ہو رہی تھی۔ مجمع سے بار بار نعرۂ تکبیر اللہ اکبر کی صدا بلند ہو رہی تھی۔ اسی دوران ایک صاحب اسٹیج پر آئے اور ایک

منضبط تحریر پر دستخط لینے لگے۔ میرے برابر میں مولانا محمد ادریس بستوی (موجودہ نائب ناظم الجامعۃ الاشرفیہ) اور مولانا یٰسین اختر مصباحی بیٹھے ہوئے تھے۔ جب یہ صاحب ہمارے قریب آئے تو میں نے ان کے ہاتھ سے کاغذ لے کر پڑھنا شروع کیا۔ اس میں ٹائی کے ناجائز اور حرام ہونے کا فتویٰ تھا جو تاج الشریعہ مولانا اختر رضا خاں کی طرف سے جاری کیا گیا تھا۔ اسی لئے اسٹیج کے علما جب اُن صاحب سے پوچھتے کہ یہ کیا ہے تو وہ کہتے کہ ٹائی کے استعمال کے بارے میں ازہری میاں صاحب کا فتویٰ ہے۔ یہ سن کر ہر کوئی تحریر پڑھے بغیر دستخط کر دیتا تھا۔ میں نے شروع سے آخر تک پڑھا اور اسی کاغذ پر لکھ دیا کہ میں نے دار العلوم اشرفیہ کے نائب شیخ الحدیث حضرت مولانا حافظ عبد الرؤف بلیاوی (رحمۃ اللہ علیہ) سے ٹائی کے استعمال کے جواز و عدم جواز کے تعلق سے دریافت کیا تھا۔ انھوں نے جواباً فرمایا تھا کہ اب یہ فیشن کے طور پر استعمال ہونے لگی ہے اور "من تشبہ بقوم فھو منھم" کے دائرے میں نہیں ہے۔ میری یہ تحریر مولانا محمد ادریس بستوی اور مولانا یٰسین اختر مصباحی نے دیکھی۔ اِن حضرات نے بھی دستخط نہیں کیے اور آں موصوف کاغذ لپیٹ کر واپس لے گئے، پھر اسٹیج پر موجود باقی علما کے دستخط نہیں لیے۔

دوسرے دن صبح کے وقت میں اپنے استاذ کریم اشرف العلما حضرت مولانا سید حامد اشرف صاحب (علیہ الرحمہ) سے نیاز حاصل کرنے دار العلوم محمدیہ گیا (جو اس اجلاس میں شریک نہیں ہوئے تھے)۔ معلوم ہوا کہ حضرت باہر تشریف لے گئے ہیں۔ جب محمدیہ کے اساتذہ کو معلوم ہوا کہ میں اس ادارے میں موجود ہوں تو کئی اساتذہ تشریف لائے۔ اُن میں ہمارے مبارک پور کے مولانا محمد حنیف صاحب بھی تھے۔ ان حضرات کو میرے اختلافی نوٹ کی خبر ہو چکی تھی۔ مجھ سے کہا گیا کہ حضرت ازہری میاں کے فتویٰ کی تحریر پر آپ نے اختلافی نوٹ لکھنے کی جسارت کیسے کی؟ میں نے کہا کہ میں نے اپنے استاذ گرامی حضرت مولانا عبد الرؤف رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے ٹائی کے استعمال کے بارے میں جو استفسار کیا تھا، وہ سوال اور اس کا جواب میں نے لکھ دیا ہے۔ اپنی طرف سے کچھ نہیں لکھا ہے۔

ممبئی عظمیٰ سے دہلی واپس آنے کے مہینہ ڈیڑھ مہینے کے بعد وہی فتویٰ کتابی شکل میں چھپ گیا۔ ایک نسخہ خاص طور پر میرے لئے بھیجا گیا۔ اس کتابچہ میں اسٹیج پر موجود علمائے کرام

کے تائیدی دستخط کے ساتھ اور بھی درجنوں علما کی تصدیقات تھیں۔

میں نے پورا فتویٰ امعان نظر سے پڑھنے کے بعد قبلہ ازہری میاں کو خط لکھا۔ ٹائی اور نکٹائی کے استعمال کی تاریخ لکھتے ہوئے یہ بھی لکھا کہ لندن کے ایک بڑے چرچ کے پادری نے خود لکھا ہے کہ ٹائی/نکٹائی نہ تو ہمارے مذہب کا شعار ہے نہ ہی قومی شعار ہے بلکہ پادری نے طنزیہ انداز میں یہ بھی لکھا تھا کہ ٹائی/نکٹائی عیسائیوں کا مذہبی شعار ہے، یہ ہمیں آپ سے معلوم ہوا۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ ازہری میاں کو خط لکھنے سے پہلے میں نے اپنے رفیق محترم مولانا ممتاز احمد اشرف القادری سے خط کے ذریعے رابطہ کیا تھا جو برطانیہ میں مقیم ہیں۔ انھیں کے ذریعے مجھے پادری کا خط موصول ہوا تھا۔ شاید کسی پاکستانی مولوی نے ٹائی کے تعلق سے چرچ سے رجوع کرکے استفسار کیا تھا کہ کیا ٹائی آپ کا مذہبی شعار ہے۔ اس کے علاوہ قرول باغ بپٹسٹ اسکول کے ساتھ جو چرچ ہے، اس کے پادری سے میں نے خود ملاقات کرکے استفسار کیا تھا۔ انھوں نے بھی یہی جواب دیا تھا کہ ٹائی سے ہمارا کوئی مذہبی تعلق نہیں ہے۔ البتہ کراس جو عام طور پر ٹائی کے ساتھ ہوتا ہے، وہ ہمارا مذہبی شعار ہے۔ میں نے کہا کہ یہ آپ تحریر کر دیجیے۔ تو انھوں نے کہا کہ ایسے فاضل کاموں کے لیے میرے پاس وقت نہیں ہے۔

اُن دنوں میں طبیہ کالج ہسپتال کا ڈپٹی میڈیکل سپرنٹنڈنٹ (DMS) تھا اور اتفاق سے ہسپتال کی ایک نرس مسز والٹر کے خلاف ایک شکایت موصول ہوئی۔ مجھے اس کی انکوائری کرنی تھی ان دنوں میری پوتی تہنیت معراج فاطمہ اسی بپٹسٹ اسکول میں پڑھتی تھی۔ جس کے منیجر مسز والٹر کے بہنوئی تھے۔ والٹر نے اپنے بہنوئی کو میرے پاس معاملہ رفع دفع کرنے کے لئے بھیجا۔ میں نے موقع غنیمت جان کر منیجر سے کہا کہ پادری صاحب سے چند روز پہلے ملاقات کرکے ٹائی کے بارے میں معلومات حاصل کر چکا ہوں اور اُن کے جواب سے مطمئن بھی ہوں لیکن میں ان سے تحریری جواب چاہتا ہوں۔ منیجر صاحب نے کہا کہ اتوار کے دن آیئے سوال نامہ بھی ساتھ میں لایئے۔ میں پادری صاحب سے جواب لکھوادوں گا۔ منیجر صاحب کے کہنے کے مطابق میں چرچ گیا۔ پادری سے ملاقات ہوئی۔ منیجر صاحب نے ان سے کہا کہ انھیں تحریر کی ضرورت ہے۔ پادری صاحب نے صاف صاف میرے سوال کے

جواب میں تحریر کیا کہ ٹائی ہمارا مذہبی شعار نہیں ہے۔ مجھ سے کہا کہ یہ دیکھئے میں چرچ میں عبادت کرنے آیا ہوں۔ میرے گلے میں ٹائی نہیں ہے اور یہ بھی کہا کہ آپ نے ٹی وی پر پوپ کو بارہا دیکھا ہوگا مگر کبھی ٹائی استعمال کرتے نہیں دیکھا ہوگا۔

میں تحریر لے کر واپس آیا۔ پھر منیجر صاحب سے میری ملاقات ہوتی رہی۔ ایک دن انھوں نے کہا کہ چرچ میں بہت سی کتابیں اردو میں ہیں۔ اب یہاں کوئی اردو کا جاننے والا نہیں ہے۔ اگر آپ چاہیں تو یہ کتابیں لے جائیں۔ میں نے کہا کہ نیک کام میں دیر کیسی۔ انھوں نے کتابیں بورے میں بھروائیں۔ میں نے رکشہ کا انتظام کیا اور کتابیں لے آیا۔ اِن میں شاہ رفیع الدین رحمۃ اللہ علیہ کا ترجمۂ قرآن (طبع اول) دیوان ذوق، آبِ حیات، دیوان مومن، دیوان بیخود دہلوی کے علاوہ بیشتر کتابیں بائبل سوسائٹی انارکلی لاہور کی چھپی ہوئی تھیں۔ تقریباً سو کتابیں لے کر آیا جو میرے مطالعے میں رہتی ہیں۔

میں نے ازہری میاں (علیہ الرحمہ) کو خط لکھا تو برطانیہ والا خط اور قرول باغ چرچ کے پادری والی تحریر کے علاوہ کئی اور تحریریں منسلک کردی تھیں۔ خط کے آخر میں میں نے لکھ دیا تھا کہ اس خط کے جواب میں اگر آپ کی تحریر ٹائی کے استعمال کے عدم جواز پر قائم رہی یعنی اگر آپ اپنے موقف پر اب بھی قائم ہیں تو مجھے آپ کا حکم شرعی نہ ماننے کی کوئی وجہ نہیں ہوگی۔

میرا خط جو آٹھ دس منسلکات کے ساتھ تھا، اس کا جواب بریلی کے ایک مفتی صاحب کی طرف سے آیا جو غیر ضروری طور پر کافی طویل تھا۔ انداز مناظرانہ تھا اور کیوں نہ ہوتا، وہ بریلی میں تشریف فرما ہیں اور میں ازہری میاں قبلہ کے موقف سے اختلاف کررہا ہوں۔ انداز میں تلخی تو ہونی ہی تھی۔ مفتی صاحب (شاید مفتی نام تھا۔ اس وقت میں اپنی یادداشت تحریر کررہا ہوں۔ میرے متذکرہ خط کی نقل اور مفتی صاحب کا جواب کہیں فائل میں ہوگا جس کی تلاش اس وقت ممکن نہیں ہے) نے اپنے جواب کی ابتدا میں لکھا کہ آپ کا خط قبلہ ازہری میاں کے نام آیا۔ انھوں نے مجھے حکم کیا کہ اس کا جواب تحریر کرو۔ یا یہ لکھا کہ یہ خط ازہری میاں قبلہ کے حکم پر لکھ رہا ہوں۔ بہرحال جواب بڑا تفصیلی تھا لیکن اس جواب کو میں نے کوئی اہمیت نہیں دی کیوں کہ میرے خط کے مخاطب قبلہ ازہری میاں تھے اور جواب میں نہ تو ان کی تائید تھی نہ یہ مختصر سا جملہ کہ

فلاں شخص کو میں جواب کے لئے مامور کرتا ہوں یہ جو کچھ لکھیں گے اس کو میرا جواب سمجھا جائے۔

الغرض ازہری میاں کی طرف سے کوئی تحریر نہیں آئی، اس لئے میں اب بھی اپنے موقف پر قائم ہوں کہ یہ نصاریٰ کا مذہبی شعار نہیں ہے۔ ناجائز وحرام نہیں ہے۔ سنا ہے کہ بدایوں شریف میں سرکار بغداد سیدنا غوث اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے صاحب سجادہ تشریف لائے تھے تو ان کے گلے میں ٹائی تھی۔

سوال:- حدائق بخشش، قصیدۂ نوریہ میں ایک شعر ہے ؎

تیری نسل پاک میں ہے بچہ بچہ نور کا
تو ہے عین نور تیرا سب گھرانا نور کا

اس شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ جملہ سادات کرام کے لئے مژدۂ جنت ہے۔ کیوں کہ جب نسل پاک کا بچہ بچہ نور ہے، تو ضرور ہے کہ سب نار سے یعنی نارِ دوزخ سے مامون ومحفوظ ہیں۔ آپ کے نزدیک شعر کا کیا مفہوم ہے؟

جواب:- بے شک ہمارے نبی محترم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے نسبت فرزندی کا فضل وشرف ارفع واعلیٰ ہے۔ اللہ تعالیٰ سادات کرام کے طفیل ہمارا خاتمہ بالخیر فرمائے۔ وان یجمعنافی الجنۃ۔

اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے ''بچہ بچہ نور کا'' لکھا ہے ''نور ہے'' نہیں لکھا ہے، اور نبی محترم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو ''تو ہے عین نور'' لکھا ہے۔ یہاں یہ نکتہ ذہن میں رہے کہ '' نور کا'' میں ''کا'' حرفِ نسبت ہے اور ''تو ہے عین نور'' میں ''ہے'' ہے جو بالاستقلال کسی شے کے ہونے کا طالب ہے۔ یہ نکتہ پیش نظر ہو تو شعر کا مفہوم غیر مبہم ہے، جو امام احمد رضا رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی فکر وعقیدت دونوں کا مظہر ہے۔

اس شعر کی قدرے تشریح سے پہلے سید السادات میر عبد الواحد بلگرامی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی توحید وتصوف پر مشتمل مشہورِ زمانہ کتاب ''سبع سنابل'' کی چند عبارات ملاحظہ ہوں، جو مفہومِ شعر تک ذہن کی رسائی کو آسان بنادیں گی۔

(۱) ''الجنۃ للمطیع وان کان عبداً حبشیا''۔

(جنت فرماں بردار کے لئے ہے خواہ وہ حبشی غلام ہو)

"والنار للعاصی وان کان سیداًقرشیا"۔

(اور دوزخ نافرمان کے لئے ہے خواہ وہ قریشی سورما ہو)

سبع سنابل میں ہے کہ یہ مبارک کلمات نبی محترم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حسنین کریمین کومخاطب کرکے ارشادفرمائے -رضی اللہ تعالیٰ عنھما-

(۲)اگرعقیدۂ خیریت خاتمہ بالقطع باتکائے فضل وشرف مصطفی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم دارند کہ خودراازفرزندان اوعلیہ الصلوٰۃ والسلام می شمارند ایں نیز باطل است الیٰ آخرہ۔

(یعنی اگر نبی محترم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی اولادنسبت فرزندی کے فضل وشرف پرتکیہ کرکے اپنی قطعی ویقینی خیریت خاتمہ شمار کرے تو یہ بھی باطل ہے الخ)۔

(۳)"سادات کہ نسبتے است بارسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم، اگرایں نسبت امروزازمنہیات بازندارد فرداازہلکات ودرکات کے بازدارد"۔

(یعنی سادات کوجورسول محترم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے نسبت فرزندی ہے، اگردنیامیں نہی عن المنکر سے باز نہ رکھے توکل روزقیامت صعوبت وعقوبت سے بازکیوں کررکھ سکے گی)۔

اللہ تعالیٰ حضرت امیر کبیر پر اپنی رحمتوں کی بارش کرے۔ یہ پوری مسلم اُمّہ کے لیے نصیحت ہے۔خدائے عزوجل ہمیں منہیات سے بازرہنے کی توفیق بخشے۔

(۴)"وآں کہ گویند کہ سادات فرزندرسول اند وآتش دوزخ برایشاں حرام است بواسطۂ فضل و شرف۔ پس اگر آتش دوزخ برایشاں حرام است آتش دنیا کہ پرتویست ازآتش دوزخ بطریق اول حرام بود۔امتحان کنیم اگرآتش دنیاعضوایشاں رانسوزد بدانیم کہ ایں سخن

تحقیقی است وگرنہ غلط وخطا است۔ اعتماد را نشاید اعتقاد را کے شاید الخ"۔

(یعنی یہ جو کہا جاتا ہے کہ سادات فرزند رسول ہیں اُن پر آتش دوزخ حرام ہے بواسطۂ فضل وشرف فرزندی، تو اگر اُن پر آتش دوزخ حرام ہے، پھر تو آتش دنیا جو کہ آتش دوزخ کا محض پر تو ہے اسے بطریق اولیٰ حرام ہونا چاہیے۔ امتحان کیے لیتے ہیں۔ اگر آتش دنیا اُن کے کسی عضوِ بدن کو نہ جلائے تو سمجھ لیا جائے کہ یہ بات بالکل حق بجانب ہے اور اگر ایسا نہیں ہے تو جب اعتماد کے لائق نہیں تو اعتقاد چہ معنی دارد)۔

فاضل بریلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے مطالعہ میں یہ کتاب رہی ہے، اور کیا عجب کہ یہی نسخۂ مطبوعہ نظامی پریس (۱۳۰۱ھ) کان پور رہا ہو، جو اِس وقت میرے پیش نظر ہے۔

مذکورۃ الصدر عبارات کی روشنی میں فاضل بریلوی کے شعر کے لفظ لفظ پر غور کیجیے، مفہومِ شعر بالکل غیر مبہم ہے یعنی یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ عین نور ہیں اور آپ کی نسل پاک کا بچہ بچہ نور گھرانے والا ہے۔ ظاہر ہے عین نور کا گھرانا نور والے کا گھرانا ہی کہلائے گا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

سوال:- آپ نے حدائق بخشش کے دو نسخوں یعنی نسخۂ صدر الشریعہ اور نسخۂ اُخریٰ کے تعلق سے بعض اشعار کے بارے میں ماہنامہ ماہ نور دہلی میں اہل علم وادب سے اپنی تحقیق پیش کرنے کی گزارش کی تھی تو اس سلسلے میں کئی اہل قلم کے مضامین آئے تھے۔ لیکن آپ نے ان پر اپنے خیالات کا اظہار یا ان اشعار کے بارے میں خود اپنا کوئی عندیہ پیش نہیں فرمایا تھا؟

جواب:- ماہنامہ ماہِ نور کے توسط سے میں نے ہند و پاک کے اہل دانش سے گزارش کی تھی کہ حدائق بخشش کے دو نسخوں میں ایک نسخہ حضرت صدر الشریعہ کا تصحیح کردہ ہے، اور دوسرے نسخے کا "نسخۂ اخریٰ" نام دے دیا تھا۔ ڈاکٹر عبد النعیم عزیزی نے متقابل اشعار کو ملاحظہ فرما کر نسخۂ صدر الشریعہ کے مصححہ اشعار کو ترجیح دی۔ کسی ایک شعر میں بھی انھوں نے نسخۂ اخریٰ کو فوقیت نہیں دی، وجہ ظاہر ہے۔ لیکن جب ماہنامہ ماہ نور کی اگلی اشاعت میں میں نے صاف کر دیا کہ یہ نسخۂ اخریٰ خود مصنف اشعار یعنی فاضل بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کا تصحیح کردہ ہے، تو

انھیں شرمندگی ہوئی۔ صاف ظاہر ہے کہ انھوں نے اشعار پر غور کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ مولانا صغیر اختر مصباحی نے اپنا جواب کافی غور وفکر کے ساتھ لکھا جس کے لئے وہ مبارکباد کے مستحق ہیں۔ لیکن بعض مقامات پر مجھے ان کی تحریر سے اختلاف ہے۔ مثلاً:

جس کی دو بوند ہیں کوثر و سلسبیل

نسخۂ صدر الشریعہ

جس کی دو بوندیں ہیں کوثر و سلسبیل

نسخۂ اخریٰ

کے تحت مولانا صغیر اختر مصباحی فرماتے ہیں کہ دو بوند ہی زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے اور اپنے جواب کو مؤکد کرنے کے لئے حدائق بخشش کا یہ مصرع پیش کیا

برسن ہارے رم جھم رم جھم دو بوند ادھر بھی گرا جانا

یہاں مجھے مولانا صغیر اختر مصباحی کے خیال سے اتفاق نہیں ہے، اور سند میں انھوں نے جو شعر پیش کیا ہے، وہ میرے نزدیک قیاس مع الفارق ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اعلیٰ حضرت نے کوثر و سلسبیل دو نہروں کا ذکر کیا ہے۔ ظاہر ہے ان دو نہروں کے خواص علاحدہ علاحدہ ہیں یا بطور تنزل کہا جاسکتا ہے کہ کچھ نہ کچھ فرق ضرور ہے۔ اس لئے اس شعر میں کوثر و سلسبیل کے لئے دو بوندیں ہی بہتر اور مناسب ہے۔ اور برسن ہارے میں ایک ہی طرح کے خواص کا پانی ہے، اس لیے یہاں دو بوند بہتر اور مناسب ہے؟

(۲)

شجر سرو سہی کس کے اگائے تیرے

نسخۂ صدر الشریعہ

شجرے سرو سہی کس کے اگائے تیرے

نسخۂ اخریٰ

اس شعر کے بارے میں مجھے معارف رضا پاکستان کے مدیر اعلیٰ جناب سید وجاہت رسول نے کئی سال پہلے متوجہ کیا تھا کہ یہ شعر "شجرے" کے ساتھ صحیح معلوم ہوتا ہے۔ اعلیٰ حضرت کے تصحیح کردہ

نسخے میں میں نے کافی غور سے یہ شعر پڑھا تو معلوم ہوا کہ کاتب نے شجر سروسہی لکھا تھا اور جب تصحیح کے لیے حضرت امام کی خدمت میں پیش کیا تو آپ نے ''ے'' بڑھا دی۔ یہ بڑھائی ہوئی ''ے'' شجر کے اوپر ہے جس سے ظاہر ہے کہ یہ ''ے'' کتابت کے بعد بڑھائی گئی ہے۔

یوں بھی سروسہی سے پہلے ''شجر'' کا لفظ زائد تھا۔ اس کے بغیر بھی سروسہی سمجھا جا سکتا تھا۔ نیز دوسرے مصرع ''معرفت پھول سہی کس کا کھلایا تیرا'' کا جملہ بتا رہا ہے کہ دونوں میں خوب تال میل کے لیے ''شجرے'' ہی بہتر اور مناسب تھا۔ اب یہاں شجر سروسہی میں جو اضافت ہے، وہ شجرے میں باقی نہیں رہ جائے گی، بلکہ شعر کا مفہوم ہی بدل جائے گا۔ دراصل یہاں ''شجرے''، تلمیحی طور پر استعمال ہوا ہے اور اس سے **''شجرۃ طیبۃ اصلھا ثابت و فرعھا فی السماء''** کی طرف اشارہ ہے بلکہ یہی مقصود ہے۔ کیوں کہ سروسہی سرو کی وہ قسم ہے جس کی فرع زمین سے سیدھی اوپر کو جاتی ہے۔ اب یہ شعر یوں لکھا پڑھا جائے گا ؂

شجرے، سروسہی، کس کے اُگائے، تیرے

معرفت، پھول سہی، کس کا کھلایا، تیرا

فاضل بریلوی کے تصحیح کردہ نسخہ میں کتابت اسی طرح کوما کے ساتھ ہے (اوگائے کو اگائے کر دیا گیا ہے۔ شرر)

یہاں مصرع اول کا سہی وہ نہیں ہے جو دوسرے مصرع کا ہے۔ وہاں ''سہی'' سرو کی ایک قسم ہے اور دوسرا سہی دوسرے مفہوم کا حامل ہے۔ جیسے ایک جملہ ہے: تم جو کہتے ہو یہی سہی۔

میں نے اپنے نسخۂ مصححہ میں ''شجر سروسہی'' باقی رکھا تھا۔ اس لیے کہ تصحیح کی بنیاد صدر الشریعہ کا تصحیح کردہ نسخہ تھا جیسا کہ میں نے حدائق بخشش مصححہ کے صفحہ ۶۳ پر اس کی وضاحت کر دی ہے۔ اس وقت تک میرے سامنے فاضل بریلوی کا تصحیح کردہ نسخہ نہیں تھا۔

ہو سکتا ہے کہ صدر الشریعہ کے سامنے جو نسخہ رہا ہو، اس میں سروسہی ہی رہا ہو اور اعلیٰ حضرت کی تصحیح ممکن ہے بعد کی ہو۔ کیوں کہ ''ے'' کا اضافہ بعد کا معلوم ہوتا ہے۔ صورت حال جو بھی ہو، میرے نزدیک ''شجرے'' ہی انسب ہے۔ یہ بھی نظر میں ہو کہ یہ شعر فاضل بریلوی نے سیدنا غوث الاعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی منقبت میں لکھا ہے نعت سرکار صلی اللہ علیہ وسلم میں نہیں۔

صاف ظاہر ہے کہ یہاں شجرۂ سلسلۂ قادریہ ذہنِ والا میں تھا۔ سلسلۂ قادریہ کے شجرے میں اکثر یہ لکھا دیکھا گیا ہے ''شجرة طيبة اصلها ثابت وفرعها في السماء'' یہاں دونوں مصرعوں کے مختلف المعنی "سہی" سے کلام میں حسن پیدا کیا گیا ہے۔

سوال:- مولانا صغیر اختر مصباحی صاحب نے ایک خط کے ذریعے آپ کو مشورہ دیا ہے کہ آپ کی تصحیح کردہ حدائق بخشش میں کچھ اغلاطِ کتابت ہیں، ان کو آئندہ اشاعت میں درست کرلیا جائے؟

جواب:- جب ۱۹۹۷ء میں حدائق بخشش رضا اکیڈمی سے شائع ہوئی تو میں نے الحاج محمد سعید نوری صاحب کو تفصیلی خط لکھ کر مطلع کیا تھا کہ آپ ممبئی سے کتابت شدہ کاپیاں قسطوں میں بھیجتے تھے۔ میں تصحیح کر کے Speed Post سے واپس کر دیتا تھا۔ مجھے یہ نسخہ دیکھ کر افسوس ہوا کہ کئی اشعار میں اب بھی غلطیاں سہو کاتب سے باقی رہ گئی ہیں۔ ابھی یہ خط بھیجا نہیں تھا کہ الحاج محمد سعید نوری صاحب سے ماہنامہ ماہ نور کے آفس میں ملاقات ہوگئی۔ اس وقت مولانا یٰسین اختر مصباحی اور محترم سید ساجد ہاشمی صاحب موجود تھے۔ میں نے نوری صاحب سے کہا کہ آپ کے نام میں نے خط لکھا ہے۔ اجازت ہو تو ان حضرات کے سامنے پڑھ کر سناؤں؟ ان کی رضا حاصل کر کے پورا خط پڑھ کر سنا دیا اور خط ان کے حوالے کر دیا۔ خط کی نقل میرے پاس ہے۔

مولانا صغیر اختر مصباحی نے چند اغلاط کتابت کی نشاندہی کے ساتھ کچھ مشورے بھی دیے جو میرے لیے ناقابل قبول ہیں۔ مثلاً

(الف)

عجب کیا اگر رحم فرما لے ہم پر
خدائے محمد برائے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

مولانا صغیر اختر نے لکھا ہے کہ ''میرے خیال میں ''فرمائے'' ہونا چاہیے۔ مگر نسخۂ صدر الشریعہ میں بھی ''فرمالے'' ہے اور اعلیٰ حضرت کے تصحیح کردہ نسخہ میں بھی صاف صاف ''فرمالے'' چھپا ہوا ہے۔

(ب)

ان کا منگتا پاؤں سے ٹھکرا دے وہ دنیا کا تاج
جس کی خاطر مر گئے منعَم رگڑ کر ایڑیاں

مولانا صغیر اختر۔ (منعِم)

نسخۂ صدر الشریعہ میں منعَم عین کے زبر سے ہے اور اعلیٰ حضرت کے نسخۂ مصححہ میں مُنعَم ہے یعنی میم پر پیش، نون ساکن، عین پر زبر۔ یہی ایک لفظ ہے جس پر اعلیٰ حضرت نے اعراب لگایا ہے۔

(ج)

ان کی حرم کے خار کشیدہ ہیں کس لیے
آنکھوں میں آئیں سر پہ رہیں دل میں گھر کریں

مولانا صغیر اختر۔ ان کے حرم

نسخۂ صدر الشریعہ اور نسخۂ مصححہ اعلیٰ حضرت دونوں میں "اون کی حرم" ہے۔ محاورات ہندوستان مؤلفہ منیر لکھنوی میں جو مذکر اور مؤنث کے صفحات کے دو کالم بنائے گئے ہیں، ان میں تانیث کے کالم میں حرم ہے

(د) وارستہ پائے بستۂ دامِ ابوالحسین

مولانا صغیر اختر۔ وارستہ پا ہے

نسخۂ صدر الشریعہ اور نسخۂ مصححہ اعلیٰ حضرت دونوں میں "وارستہ پائے" ہے۔ اس میں غلط کیا ہے۔ اس سے تو مفہوم دوبالا ہو رہا ہے۔

(ہ) اے بندۂ جدودِ کرامِ ابوالحسین

مولانا صغیر اختر۔ ہے بندۂ

یہاں بھی دونوں نسخوں میں "اے بندۂ" ہے اور مفہوم بھی واضح ہے۔

(و)

سوکھے دھانوں پہ ہمارے بھی کرم ہوجائے
چھائے رحمت کی گھٹا بن کے تمھارے گیسو

مولانا صغیر اختر- چھائیں

نسخۂ صدر الشریعہ و اعلیٰ حضرت دونوں میں ''چھائے'' ہے اور یہی صحیح اور فصیح ہے۔ مفہوم ظاہر ہے۔

(ز) چھائے ملائکہ ہیں لگاتار ہے ورود

مولانا صغیر اختر- درود

نسخۂ صدر الشریعہ میں ''ورود'' ہے۔ حدائق بخشش کا دوسرا حصہ اعلیٰ حضرت کی حیات میں شائع نہیں ہوا، لیکن ورود ہی صحیح ہے اس شعر پر فٹ نوٹ میں چھ سطروں میں تفصیل موجود ہے جو ورود پر دال ہے۔

(ح)

معنی یہ ہیں مانی کہ کرم کیا مانے
کھنچنا تو یہاں کسی سے ٹھہرا ہی نہیں

مولانا صغیر اختر- ذرا تقطیع کر کے دیکھ لیں

شاید برادرم مولانا صغیر اختر کو اس کی تقطیع میں دشواری پیش آئی۔ اس وزن پر تقطیع کرلیں۔

معنی یہ ہیں مانی کہ کرم کیا مانے
مفعول مفاعیل مفاعیلن فع
کھنچنا تو یہاں کسی سے ٹھہرا ہی نہیں
مفعول مفاعلن مفاعیل فعل

(ط)

خضر است گویاں العطش موسیٰ بایمن گشتہ غش
یعقوب شد بینا ئیش در یادت اے جان جہاں

مولانا صغیر اختر- گویا- بلا نون غنہ

سمجھ میں نہیں آتا کہ گویاں میں کیا قباحت ہے۔ گفتن کا اسم فاعل سماعی گویا اور گویاں دونوں آتا ہے۔ (بحوالۂ قاعدہ المعروف بہ تسہیل المصادر، ص: ۴۴، مصنفہ مفتی عبد

الرشید خاں اشرفی رحمۃ اللہ علیہ، فاروقیہ بک ڈپو، دہلی)۔

(ی)

مری ظلمتیں ہیں ستم مگر ترا مہ نہ مہر کہ مہر گر
اگر ایک چھینٹ پڑے ادھر شب داج ابھی تو نہار ہے

مولانا صغیر اختر- یہاں ابھی یا بھی زیر غور ہے

کچھ غور وفکر کی ضرورت نہیں۔ جو نسخہ میں ہے، صحیح ہے۔ ''یہاں بھی'' کا کوئی مفہوم نہیں۔ دوسرے مصرع کے تیور پر ذرا غور کیجیے۔

(ک)

کبھی زندگی کے ارماں کبھی مرگ نو کا خواہاں
وہ جیا کہ مرگ قرباں وہ موا کہ زیست لایا- کہے روح ہاں جلایا

مولانا صغیر اختر- مرا

اگر کسی معتبر نسخہ میں ''موا'' کی جگہ ''مرا'' ہے تو بے شک تبدیل کر دیجیے ورنہ یہ تو اصلاح ہو جائے گی۔ ''موا'' میں کیا قباحت ہے۔

سوانحی خاکہ

نام : فضل الرحمٰن (ایف آر شرر مصباحی)

ولدیت : الحاج عبدالسمیع

تاریخ ولادت : 15 جون 1944ء

مسقط الرأس : محلہ کٹرہ، پوسٹ مبارک پور، ضلع اعظم گڑھ، یو، پی

تعلیمی لیاقت:

☆ فاضل دینیات، دارالعلوم اہل سنت مدرسہ اشرفیہ مصباح العلوم، مبارک پور، اعظم گڑھ، یو پی

☆ مولوی، عربی وفارسی امتحانات بورڈ، الٰہ آباد، یو پی

☆ عالم، عربی وفارسی امتحانات بورڈ، الٰہ آباد، یو پی

☆ فاضل ادب (عربی)، لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ، یو پی

☆ ایف ایم بی ایس، بورڈ آف انڈین میڈیسن اتر پردیش لکھنؤ

تدریس:

☆ معین المدرسین، دارالعلوم اہل سنت مدرسہ اشرفیہ مصباح العلوم، مبارک پور، اعظم گڑھ (دوران تعلیم تین سال)

☆ ڈیمانسٹریٹر، تکمیل الطب کالج، لکھنؤ، اتر پردیش (1972-1979)

☆ لکچرر، ایسوسی ایٹ پروفیسر، اے اینڈ یو طبیہ کالج، دہلی یونیورسٹی، دہلی (2004-1979)

اضافی عہدے/ذمہ داریاں

☆ ریزیڈینٹ میڈیکل آفیسر، تکمیل الطب کالج، لکھنؤ، یو پی

☆ اسسٹنٹ پروکٹر، تکمیل الطب کالج، لکھنؤ، یو پی

☆ فزیشین، تکمیل الطب کالج اسپتال برانچ قیصر باغ، لکھنؤ، یو پی

☆ چیف ایڈیٹر، تکمیل الطب کالج میگزین، تکمیل الطب کالج لکھنؤ، یوپی
☆ گیمس سپرنٹنڈنٹ، تکمیل الطب کالج لکھنؤ، یوپی
☆ سکریٹری، آل انڈیا ہندی اردو سنگم، اتر پردیش اسٹیٹ
☆ ایڈیٹر، ہمارا سنگھرش (اردو)، آل انڈیا سنڈیکیٹ کانگریس، یوپی
☆ صدر شعبۂ معالجات، اے اینڈ یو طبیہ کالج، دہلی یونیورسٹی، دہلی
☆ ڈپٹی میڈیکل سپرنٹنڈنٹ، اے اینڈ یو طبیہ کالج، دہلی یونیورسٹی، دہلی
☆ سرپرست، طبیہ کالج میگزین، اے اینڈ یو طبیہ کالج، دہلی یونیورسٹی، دہلی
☆ لائبریری انچارج، اے اینڈ یو طبیہ کالج، دہلی یونیورسٹی، دہلی
☆ رکن کورسز کمیٹی، اے اینڈ یو طبیہ کالج، دہلی یونیورسٹی، دہلی
☆ رکن اتھیکل کمیٹی، اے اینڈ یو طبیہ کالج، دہلی یونیورسٹی، دہلی
☆ سابق جنرل سکریٹری، آل انڈیا یونانی طبی کانگریس، نئی دہلی
☆ سابق نائب صدر، آل انڈیا مومن کانفرنس، دہلی اسٹیٹ
☆ سابق سرپرست، آل انڈیا یونانی جوائنٹ ایکشن کمیٹی
☆ رکن، لٹریری ریسرچ سب کمیٹی، سنٹرل کونسل فار ریسرچ اِن یونانی میڈیسن، وزارت آیوش، حکومت ہند
☆ کنسلٹنٹ، یونانی میڈیکل سنٹر، ڈاکٹر رام منوہر لوہیا اسپتال، نئی دہلی
☆ کنسلٹنٹ، یونانی اسپیشلیٹی سنٹر، دین دیال اپادھیائے اسپتال، نئی دہلی
☆ رکن مجلس شوریٰ الجامعۃ الاشرفیہ، مبارک پور، اعظم گڑھ، یوپی

☆ Chair Ferson, Selection CommiteeTKDL Ministry of Science andTechnology Govt. of India

☆ Eminent TKDL Unit, CSIR, Ministry of Science and Techonolgy, Govt. of India

اساتذہ:

☆ حافظ ملت حضرت مولانا حافظ عبدالعزیز مرادآبادی
☆ حضرت مولانا حافظ عبدالرؤف بلیاوی
☆ حضرت علامہ مظفر حسن ظفر ادیبی مبارک پوری
☆ حضرت مولانا مفتی عبدالمنان اعظمی مبارک پوری
☆ حضرت مولانا قاضی محمد شفیع اعظمی مبارک پوری
☆ حضرت مولانا قاری محمد یحییٰ مبارک پوری
☆ حضرت مولانا سید حامد اشرف اشرفی جیلانی کچھوچھوی
☆ حضرت مولانا سید شمس الحق گجہڑوی
☆ پروفیسر صمدی، صدر شعبۂ دراسات شرقیہ، لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ
☆ پروفیسر سید شبیہ الحسن نونہروی، لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ
☆ حکیم شکیل احمد شمسی، تکمیل الطب کالج، لکھنؤ
☆ حکیم محمد مسیح الزماں ندوی، تکمیل الطب کالج لکھنؤ
☆ حکیم سید محمد فاروق رضوی، تکمیل الطب کالج، لکھنؤ
☆ حکیم خواجہ ساجد حسن کشمیری، تکمیل الطب کالج، لکھنؤ
☆ حکیم محمد احمد صدیقی، تکمیل الطب کالج، لکھنؤ
☆ حکیم فیاض علی صدیقی، تکمیل الطب کالج، لکھنؤ
☆ حکیم عبدالجلیل، تکمیل الطب کالج، لکھنؤ
☆ حکیم عبدالرحمن رحمانی تکمیل الطب کالج، لکھنؤ
☆ ڈاکٹر تربینی، بہادر، تکمیل الطب کالج، لکھنؤ
☆ ڈاکٹر محمد اکمل شمسی، تکمیل الطب کالج، لکھنؤ
☆ ڈاکٹر محمد شعیب، تکمیل الطب کالج، لکھنؤ

نامور تلامذہ:

☆ حکیم وسیم احمد اعظمی، سابق ڈپٹی ڈائریکٹر، سنٹرل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ آف یونانی میڈیسن، لکھنؤ (سنٹرل کونسل فار ریسرچ اِن یونانی میڈیسن)
☆ ڈاکٹر محمد شعیب اعظمی، ڈین، فیکلٹی آف یونانی میڈیسن، راجستھان آیوروید یونیورسٹی، جودھپور، راجستھان وسابق ممبر سی سی آئی ایم منسٹری آف آیوش، نئی دہلی
☆ ڈاکٹر محمد سکندر حیات، ڈائریکٹر، یونانی سروسز، حکومت اتر پردیش
☆ ڈاکٹر محمد ادریس خاں، پرنسپل، اے اینڈ یو طبیہ کالج، نئی دہلی
☆ ڈاکٹر قمر الہدیٰ انصاری، انچارج اسلامیہ ہاسپیٹل، مبارک پور، ضلع اعظم گڑھ
☆ ڈاکٹر شارق ظفر، پریسیڈنٹ، ہولسٹک ہیلتھ کیئر اینڈ ریسرچ آرگنائزیشن، مہاراشٹرا
☆ پروفیسر سید محمد اکبر رضوی، اے اینڈ یو طبیہ کالج، نئی دہلی
☆ پروفیسر یوسف جمال، اے اینڈ یو طبیہ کالج، نئی دہلی
☆ ڈاکٹر ایس پی بھٹناگر، سابق پرنسپل، علامہ اقبال یونانی میڈیکل کالج، مظفر نگر، اتر پردیش
☆ پروفیسر رئیس الرحمٰن، سابق صلاح کار (یونانی)، وزارت آیوش، حکومت ہند
☆ دکتور سید کمال الحوت حفید مفتی لبنان خواجہ محمد درویش، تلمیذ ابن عابدین شامی، صاحب فتاویٰ، بیروت، لبنان
☆ دکتور سید سمیر فاعور، بیروت، لبنان
☆ دکتور سید شفیق الدیک، بیروت، لبنان
☆ مولانا فداء المصطفیٰ (صاحبزادۂ صدر الشریعہ حضرت مولانا محمد امجد علی)
☆ مولانا علی احمد سیوانی

تصنیفات (مطبوعہ)

☆ نمود سحر
☆ ظہور قدسی
☆ محاسبے

☆ معارضہ بر محاسبے کا محاسبہ

☆ غمزۂ چشم ہمزہ

☆ حدائق بخشش (تصحیح شدہ) کا جائزہ

☆ نقد و نظر (جزء اول)

ایوارڈ:

☆ سروس ڈاکٹرس ایوارڈ 2000/2001، حکومت دہلی بدست وزیر اعلیٰ، دہلی

☆ حافظ ملّت ایوارڈ بدست سربراہ اعلیٰ الجامعۃ الاشرفیہ، مبارک پور

مرتبہ:

احمد جمال

اعتراف/حوصلہ افزائی

(مکمل عبارات غمزۂ چشم ہمزہ میں)

● إني سعيد جدا بلقاء شاب نبيل وأديب ألمعي فضل الرحمٰن المصباحي المباركفوري، في هذا التجوال العلمي الهندي وفرحان كثيرا من حبه لغة القرآن، وقد تصفحت كتابه الثمين (مصباح الأدب شرح أزهار العرب) واطمأنت به.

محمد حسن الأعظمي (من علماء الأزهر) وعميد كلية اللغة العربية بكراتشي

● آپ کا خیال صحیح ہے۔ "تقلید کافر" بلا اضافت ہے، تقلید کی بنا پر چند روز کے لیے کافر ہوا نہ کہ کافر کا مقلد ہوا۔

اثرلکھنوی (نواب جعفر علی خاں) (بحوالۂ غمزۂ چشم ہمزہ، ص ۱۱۶ :)

● مولوی محمد فضل الرحمٰن شرر مصباحی دار العلوم اشرفیہ مبارک پور کے ان چند مخصوص طلبہ میں سے ہیں جو صحیح معنی میں اس عظیم درس گاہ کی زینت کہے جا سکتے ہیں۔ .... عزیزی شرر نے اس خدمت کو جس خوبی سے انجام دیا ہے، وہ یقیناً تبریک و تہنیت سے بے نیاز ہے۔

نیاز فتح پوری (بحوالۂ غمزۂ چشم ہمزہ، ص ۱۱۶ :)

● آپ کی فارسی منقبت تو اتنی عظیم ہے کہ اس کے اظہار کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں زبان انتہائی شگفتہ، فصیح و بلیغ، معانی اتنے دقیق و رفیع کہ اب تک ان کی طرف کسی کا ذہن نہیں گیا پھر کہیں کہیں الفاظ کی شوکت نے چار چاند لگا دیے۔

محمد شریف الحق امجدی (شارح بخاری) (بحوالۂ غمزۂ چشم ہمزہ، ص ۱۲۱ :)

● ۱۳/ ماہ رواں کا عنایت نامہ نظر نواز ہوا اور منظوم تعارف پڑھ کر تو گویا روح تازہ ہو گئی۔ آپ نے بہت مہذب اور دل کش انداز سے منظوم تعارف لکھا ہے۔ اس کو کہیں شائع ہونا چاہیے۔

عنوان چشتی (بحوالۂ غمزۂ چشم ہمزہ، ص ۹۴ :)

● عزیزم سبحان اللہ، کیا غزل کہی ہے اچھے اچھے شاعر اس قدرت اور آگاہی کے ساتھ نہیں کہہ سکتے۔

نشور واحدی (بحوالۂ غمزۂ چشم ہمزہ، ص ۱۲۴ :)

● .... آپ نے اسے درست فرما دیا تو درست ہے۔ میں آپ کو سند مانتا ہوں۔ اگر غلط بھی ہو تو درست فرما دیں، مجھے آپ کی ہر اصلاح قبول ہو گی۔

برق عفی عنہ (پروفیسر سید محمد طلحہ برق رضوی) (بحوالۂ غمزۂ چشم ہمزہ، ص ۷۹ :)

Published by
MANZAR SAYEED
E-244/P, Street No 23, Shaheen Bagh, Okhla, New Delhi 110025